إِنۡ أُرِيۡدُ إِلَّا الۡإِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

نومبر ۲۰۱۸ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ **البرہان** لاہور

جلد ۲۲، شمارہ ۱۱، نومبر ۲۰۱۸ء/صفر المظفر ۱۴۴۰ھ

مشمولات

O تعلیم و تربیت

- شُہدے استاد — پروفیسر ملک محمد حسین — ۴
- پروفیسروں کو ہتھکڑیاں لگنے پر — شورش کاشمیری — ۵
- اساتذہ کی ذلت و رسوائی — ڈاکٹر محمد امین — ۶
- تعلیم اور استحکام پاکستان — پروفیسر ملک محمد حسین — ۷
- ہماری یونیورسٹیوں میں کیا ہو رہا ہے؟ — پرفیسر عاصم حفیظ — ۱۵

O تزکیۂ نفس

- تزکیۂ نفس اور جدید اسلامی تحریکیں — استفادہ از موسیٰ بھٹو — ۱۶

O اسلام اور پاکستان

- سیکولر عدلیہ کا ایک اور وار — مدیر — ۲۲
- ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟ — ۲۳

O اسلام اور مغرب

'قومی ریاست' اور 'قوم پرستی' کے مغربی تصورات اُمہ اور اس کی روایات و مفادات کو تباہ کر رہے ہیں — پروفیسر راحیل اعظم — ۲۴

O فہم دین

- فکری افلاس یا امت سے غداری؟ جاوید احمد غامدی غلام احمد قادیانی کے نقشِ قدم پر — ڈاکٹر محمد امین — ۲۷
- ریاستِ مدینہ: پاکستان کی دینی قوتیں مدینہ جیسی ریاست کیوں قائم نہیں کر سکیں اور کروا سکیں؟ — مدیر — ۳۲

O دینی تحریکیں

ارکانِ جماعتِ اسلامی کی توجہ کے لیے دستوری تقاضوں کے مطابق ارکانِ جماعت انتخابِ قیادت میں موثر کردار کس طرح ادا کر سکتے ہیں؟ — عبداللطیف خان گنڈا پور — ۳۶

تعلیم و تربیت		پروفیسر ملک محمد حسین

شُہدے استاد

میں خود استاد ابن استاد ابن استاد ہوں۔ میری تمام بیٹیاں اور بیٹا بھی استاد ہیں لیکن اب سوچتا ہوں کہ کاش میں راؤ انوار ہوتا، میں ایان علی ہوتا، جہانگیر ترین ہوتا، بابر اعوان ہوتا اور بڑی بات ہوتی اگر میں عمران خان ہوتا کیونکہ ان سب کے خلاف نیب کے کیسز اور انکوائریاں ہونے کے باوجود ہتھکڑیاں تو کیا کسی قسم کی بدتمیزی نہیں کی گئی بلکہ ان سب ملزمان نے درجہ بدرجہ بدتمیزیاں کیں لیکن قانون نافذ کرنے والے اداروں نے اور نیب نے کھلے دل کا مظاہرہ کیا اور ان سب کی عزت نفس کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ بس ایک ہی شہدی قوم کے شُہدے وائس چانسلرز اور پروفیسرز ہی بچے تھے جن کو نمازی، روزہ دار اور بقول شخصے تہجد گزار ڈی جی نیب نے، جو شاید خود بھی جعلی ڈگری کا کیس مبینہ طور پر بھگت رہے ہیں، زنجیروں میں جکڑ کر نیب عدالت میں پیش کرنا ضروری سمجھا۔ یہ شاید ۷۰، ۷۵ سال کے نوجوان لفنگے تھے جن کے بھاگ جانے کا خطرہ تھا کہ انہیں زنجیروں میں جکڑنا ضروری سمجھا گیا۔ ابھی تو انہیں بعض الزامات کے تحت محض انکوائری کے لیے بلایا گیا تھا، وہ نہ چور تھے، نہ ڈاکو تھے نہ سمگلر تھے اور نہ منی لانڈرر۔

یہ علم اور اہلِ علم کا دشمن معاشرہ پہلے ٹی وی پر بٹھا کر ڈاکٹر عبدالقدیر خان جیسے قوم کے محسن سائنسدان کو نا کردہ گناہوں کی معافی منگواتے ہوئے بے قیر کرتا ہے پھر ڈاکٹر اکرم چوہدری، ڈاکٹر مجاہد کامران اور دس دیگر صاحبانِ علم کو زنجیروں میں جکڑ کر جانوروں کی طرح عدالت میں لے جاتے ہوئے وڈیو وائرل کرتا ہے اور یہ اعلان کرتا ہے کہ آئندہ نسلوں کو سبق دینے کی خاطر کہ وہ آئین شکن جنرل پرویز مشرف بن جائیں، دوسروں کے لیے منی لانڈرنگ کرنے والی ایان علی بن جائیں، درجنوں کے قاتل راؤ انوار بن جائیں، اربوں کھربوں ڈکارنے والے سیاستدان اور بیوروکریٹ بن جائیں لیکن استاد نہ بنیں۔ عزت مآب چیف جسٹس جناب ثاقب نثار نے بھی نوٹس تو لیا لیکن کمال شفقت اور مہربانی فرماتے ہوئے ڈی جی نیب سے درگزر فرمالیا۔ وزیر اعلیٰ پنجاب جو کمزوروں کے حامی ہیں ان کی طرف سے بھی اس زیادتی کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہا گیا حتیٰ کہ نئے پاکستان کے بانی جناب وزیر اعظم بھی منقار زیر پر رہے کہ معاملہ ان کے کس کھلاڑی کا نہیں شُہدے استادوں کا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ معاشرہ عزت داروں کے رہنے کے قابل شمار کیا جاسکتا ہے؟

پروفیسروں کو ہتھکڑیاں لگنے پر۔ عالمِ بالا سے ایک صدا

کہہ نہیں سکتا پسِ دیوارِ زنداں کیا ہوا
ایک محشر صورتِ حالات سے پیدا ہوا

نَیب کے زندان میں چنگیز خاں کا جانشین
صاحبانِ علم و عرفان پر ستم آور ہوا

اُن ستم پیشوں کے ہاتھوں اُن نظر بندوں کے ساتھ
جو ہوا، جیسا ہوا المختصر بُرا ہوا؟

اس خراب آباد کے ویراں کدے میں روز و شب
دیکھتا ہوں چہرۂ علم و فضل اُترا ہوا

آپ اس کی دھڑکنوں سے داستاں سُن لیجیے
میرے پہلو میں ہے دلِ مرحوم دُکھتا ہوا

کشتگانِ ستم تھک کے آخر رہ گئے
گردشِ دوراں سے ہر مردِ خدا رُسوا ہوا

آشکارا ہو چکی ہے گردشِ لیل و نہار
نَیب کا ہر ہر قدم ہے ظلم میں لتھڑا ہوا

ماند ہو کر رہ گئے نعرہ ہائے رنج و غم
ہر معلم نَیب کی درگاہ میں جا رُسوا ہوا

اس وطن سے رونے دھونے کا زمانہ لد گیا
کام کیا آئے گا اے شورشؔ ترا لکھا ہوا

(شورش کاشمیری کا پس از مرگ واویلا)

[تصرف پروفیسر ملک محمد حسین]

تعلیم و تربیت مدیر

یہ کیسی 'تبدیلی' ہے؟ عمران خاں کے دور میں

اساتذہ کی ذلت و رسوائی

بہت سے لوگ توقع کر رہے تھے کہ عمران خاں کے حکومت میں آنے سے کچھ مثبت اور خوشگوار تبدیلیاں معاشرے میں رونما ہونا شروع ہوں گی۔ لیکن پچھلے ڈیڑھ ماہ میں انہوں نے اور ان کی ٹیم نے جو کام کیا ہے وہ تعمیری اور خوشگوار کم اور غیر تعمیری اور تکلیف دہ زیادہ رہا ہے۔ ان میں مہنگائی میں اضافہ، تجاوزات گرانے میں غریبوں کا نقصان، ختم نبوت اور توہین رسالت جیسے حساس معاملات میں بے جا مداخلت اور نیب کی طرف سے سینئر اساتذہ کو ہتھکڑیاں پہنا کر انہیں عدالت میں پیش کرنا شامل ہیں۔

ہم کرپشن کے سخت خلاف ہیں اور اس امر کے شدید حامی ہیں کہ جو بھی کرپشن کرے اسے کیفر کردار تک ضرور پہنچانا چاہیے اور اسے سخت سے سخت سزا دینی چاہیے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جرم ثابت ہونے سے پہلے شرفاء کو ذلیل کیا جائے، اور انہیں نہ صرف ہتھکڑیاں لگائی جائیں بلکہ اس امر کا موقع بھی دیا جائے کہ ہتھکڑیوں میں جکڑے پروفیسروں کی تصویریں بنیں اور وہ پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا میں وائرل ہوں۔ پروفیسر مجاہد کامران پر بظاہر یہ الزام ہے کہ انہوں نے لوگوں کو ملازمتیں دیں اور پروفیسر اکرم چوہدری پر الزام ہے کہ انہوں نے اشاعت تعلیم کے لیے یونیورسٹی کے سب کیمپس کھلوائے۔ بظاہر یہ دونوں کام جرم نہیں۔ تاہم اگر ان کاموں میں قواعد وضوابط کی کوئی خلاف ورزی ہوئی بھی ہے تو بھی یہ ایسا جرم نہیں جس کے لیے انہیں ذلیل و رسوا کیا جاتا۔

اور مزید افسوسناک یہ کہ اس حادثہ کو ہوئے آج (۱۸/اکتوبر ۲۰۱۸ء کو) ایک ہفتہ ہو گیا اور آج تک صدر پاکستان، وزیر اعظم عمران خاں، مرکزی وزیر تعلیم، صوبے کے گورنر، چیف منسٹر اور وزیر تعلیم کسی کی طرف سے معذرت کا بیان نہیں آیا اور نہ ہتھکڑیاں لگانے والوں کے خلاف تادیبی کاروائی کا اعلان ہوا ہے۔

جو قوم اپنے اساتذہ کی عزت نہیں کرتی وہ معزز کیسے ہو سکتی ہے؟

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

تعلیم اور استحکامِ پاکستان

ریاستِ مدینہ کے تسلسل میں بننے والی عظیم ریاست جس کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے، وجود میں آنے کے ۲۵ سال کے اندر دولخت ہوگئی، اور اب بھی خاکم بدہن اپنے بھی اور پرائے بھی ایسی افواہیں چھوڑتے رہتے ہیں جن سے استحکام وطن کی تصویر دھندلی ہوجاتی ہے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں مملکت خداداد دولخت کیوں ہوئی؟ بلاشبہ اس کی کئی وجوہات ہیں لیکن کھوج لگایا جائے تو بات تعلیم اور استاد پر جا کر ٹھہرتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں اساتذہ کے انتخاب اور تقرر میں بے تدبیری اور تعلیمی عمل کے بارے میں چشم پوشی نے وہ دن دکھایا جس کا مسلمان قوم نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

اب ذرا آتے ہیں اس بات کی طرف کہ وہ کون سے عناصر ہیں جو ملکی استحکام کو مربوط بنیاد فراہم کرتے ہیں، اور ان عناصر کی ترویج وارتقا کے لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین اور قانون میں کیا Provisions رکھی گئی ہیں اور ہم نے سیاسی اور انتظامی سطح پر ان Provisions کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ کیا نتائج سامنے آرہے ہیں اور ان برے نتائج سے بچنے کے لیے ہمیں کرنا کیا ہے؟ ملی اور قومی استحکام کو تقویت دینے والے چند ایک عناصر یہ ہیں:

۱۔ نظریہ حیات یا قومی آئیڈلوجی کے ساتھ وابستگی۔

۲۔ قومی سطح پر موثر وسیلۂ ابلاغ کا وجود اور اس کا احترام۔

۳۔ فکر و عمل کی ہم آہنگی۔

۴۔ متبادلات اور متبادل سوچ کے سلسلہ میں وسیع الفکری اور وسیع القلبی۔

۵۔ قومی سطح پر تبادلۂ خیال اور مکالمہ کا ماحول۔

۶۔ معاشرے میں عدل اجتماعی کا چلن۔

۷۔ خوشحال مستقبل کا یقین۔

۸۔ علم اور اہل علم کی توقیر اور احترام۔

قومی استحکام کے لیے نظریۂ حیات اور قومی آئیڈلوجی کے ساتھ وابستگی کی کیا ضرورت ہے، اور بنی نوع انسان کے مجموعی تجربے نے اس کے حق میں تاریخ عالم سے کیا دلائل فراہم کیے ہیں، میرے خیال میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے ذکر صرف اس بات کا کرنا ہے کہ آئین جو کسی قوم کا متفق علیہ عمرانی معاہدہ ہوتا ہے اس میں اس سلسلہ میں کیا بنیادیں فراہم کی گئی ہیں۔

۱۹۷۳ء کے آئین میں شامل قرار داد مقاصد اور آئین کا آرٹیکل نمبر ۳۱ نہایت صراحت کے ساتھ تعلیم وتدریس میں اسلامی نظریۂ حیات کی ترویج کا راستہ فراہم کرتا ہے قرارداد مقاصد میں ایک بیان یہ ہے:

The Muslims shall be enabled to order their lives in the individual and collective fields in accordance with the teachings and requirements of Islam as narrated in the Holy Quran and sunnah.

اور آئین کا آرٹیکل نمبر ۳۱ بیان کرتا ہے۔

1. Steps shall be taken to enable the Muslims of Pakistan individually and cillectively to order their lives in accordance with fundamental princples and basic concepts of Islam and to provide facilites whereby they may be able to lead their lives in the light of Holy Quran and Sunnah.

2. The state shall endeavour. as respects the Muslims of Pakistan to make the teaching of Holy Quran and Islamiat compulsory to encourage and facilitate the learning of Arabic language and to secure correct and exact printing and publishing of the Holy Quran.

3. To promote unity and observance of the Islamic moral standards.

مختلف حکومتوں نے قرارداد مقاصد اور مذکورہ آئین کے آرٹیکل کے ساتھ کیا سلوک کیا، اس کا مظاہرہ تعلیمی اداروں کے ماحول، نصاب وکتاب کے مندرجات اور طلبہ کی تربیت کے لیے ہم نصابی سرگرمیوں اور امتحانوں کے کھلے چھپے رازوں سے کیا جا سکتا ہے۔ ٹیلی ویژن تعلیم وتربیت کے لیے ایک وسیع الاثر اور پورے ملک پر پھیلا ہوا کلاس روم ہے۔ یہ قوم کے بچوں،

نوجوانوں، مردوں، عورتوں کو صبح وشام جو تربیت دے رہا ہے وہ دستور پاکستان کی شق نمبر ۳۱ کا کس طرح مذاق اُڑا رہی ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ لاہور میں خواتین کے ایک نامور کالج میں طالبات کی روحانی بالیدگی کے لیے میوزک گروپ کی اچھل کود کروائی جاتی ہے۔ شاید یہ بھی اسلامی نظریۂ حیات اور قرارداد مقاصد کا تقاضا ہے۔ یہ ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

اب ذرا آیئے دوسرے نکتہ کی طرف جو قومی سطح پر موثر ذریعہ ابلاغ کے ہونے اور اس کے احترام سے متعلق ہے۔ قومی سطح پر موثر ذریعہ ابلاغ سوائے اردو کے اور کوئی نہیں۔ اردو نہ صرف پاکستان کے اندر رابطہ کی زبان ہے بلکہ پورے خطے میں برما سے افغانستان تک اور بھوٹان سے مالدیپ تک، حتیٰ کہ خلیجی ریاستوں میں بھی، اردو ہی ایک مشترکہ زبان ہے جو باہمی ابلاغ کا کام دیتی ہے۔ قومی آئیڈیالوجی کے نشرو ترویج کا موثر راستہ بھی اردو ہی ہے لیکن ہم نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا وہ کسی زندہ باغیرت قوم کا شیوہ نہیں ہے۔ آزادی کے پچاس سال گزرنے کے باوجود آج تک ہم غلط سلط انگریزی میں خط وکتابت کیے جارہے ہیں لیکن درست اور سمجھ میں آنے والی زبان اردو میں حکومتی شب وروز کی کاروائی ہمارے اسٹیٹس کو کم دیتی ہے۔ ہم نے اردو کو دھکیلتے دھکیلتے مہاجروں کی زبان بنادیا ہے اور قومیتوں کا نعرہ تخلیق کر کے قومی زبان کو ایک خودساختہ ذیلی قومیت کے ساتھ منسلک کردیا ہے۔

۱۹۷۳ء کے دستور میں اردو کے نفاذ کے لیے پندرہ سال کی جو مدت رکھی گئی تھی اسے ہم نے مسلسل نظر انداز کیا اور سپریم کورٹ کے فیصلے کے باوجود نظر انداز کیے جارہے ہیں۔ اور اب تو انگریزی کی بالادستی اور علاقائی زبانوں کا تاثر اس قدر چھا گیا ہے کو قومی ریاستی زبان کے طور پر اردو کی اہمیت ہی ہمارے ذہنوں سے محو ہوگئی ہے۔ اگر یہی صورت حال رہی تو علاقائی منافرت اس قدر بڑھے گی کہ مختلف صوبوں کے لوگ خدانخواستہ ایک دوسرے کے لیے غیر ملکی بن جائیں گے۔ انگلش میڈیم کے کریز نے ایسے نوجوان خواتین وحضرات کو میدان کار میں پہنچانا شروع کردیا ہے جو انگریزی تو فرفر بولتے ہیں لیکن اردو نہ تو لکھ سکتے ہیں نہ پڑھ سکتے ہیں، صرف زبانی حد تک انگریزی نما اردو سے آشنا ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ مرض پھیلے گا اور نتیجہ اس کا جو نکلے گا اسے بخوبی چشم تصور میں لایا جاسکتا ہے۔ قومی استحکام کی لسانی پالیسی کے نہ ہونے کی وجہ سے جو خطرات لاحق ہیں اسے ہمیں اخلاص کے ساتھ محسوس کرنا چاہیے۔

قومی نظریۂ حیات اور قومی رابطے کی زبان فکر و عمل کی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ مختلف نصابات اور درسی کتب میں اسے کس طرح سمویا جاتا ہے، سماجی شعور کی نشوونما نصاب و کتاب کے ذریعے کس طرح کی جاتی ہے، تاریخ او جغرافیہ کے تانے بانے آئندہ نسلوں کے ذہنوں میں کس طرح راسخ کیے جاتے ہیں، سائنس ٹیکنالوجی اور قدرتی وسائل سے فیضیابی کا کیا نقشہ مستقبل میں قائدین اور کارکنوں کی شخصیت کے ساتھ مربوط کیا جاتا ہے، یہ سب کچھ قومی تعلیمی پالیسی اور قومی نصاب کا مرہون منت ہے۔ نصابات اور تعلیمی معیارات کو پاکستان کے آئین کی کنکرنٹ لسٹ میں مرکزی وزارت تعلیم کے ہاتھ میں دے دیا گیا تھا تاکہ تعلیمی نظام میں یکساں نصاب، یکساں تدریسی کتب، یکساں معیارات اور یکساں قومی سوچ بروئے کار لائی جاسکے اور اس طرح استحکام وطن کے تقاضے پورے ہوں۔ دستور کی ان Provisions کو ایجوکیشن ایکٹ نمبر ۱۰ آف ۱۹۹۶ء میں قانونی شکل دی گئی تھی جس میں بڑی صراحت کے ساتھ درج تھا کہ قومی نصاب پاکستان کے تمام تعلیمی اداروں پر لاگو ہوگا، تعلیمی اداروں میں رائج درسی کتب مرکزی وزارتِ تعلیم کی منظور شدہ ہوں گی، تعلیمی معیارات مقرر کرنے اور ان کی نگرانی کرنے کا اختیار بھی وزارت تعلیم کے پاس ہوگا، نیز نصاب و کتاب میں کوئی ایسا تصور نہیں دیا جائے گا جو اسلام اور نظریۂ پاکستان کے تقاضوں کے منافی ہو لیکن اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے یہ سب ختم کر دیا گیا۔

اتنے حسین و جمیل انتظامات اور اتنے مستحکم قانونی و دستوری فیصلوں کے باوجود کیا ہوتا رہا؟ پبلک سکولز اور پرائیویٹ سیکٹر کے تمام تعلیمی ادارے پاکستان کے قومی نصاب سے مکمل طور پر آزاد ہو چکے ہیں اور آئین و قانون کے پاسبان شاید اس جرم کے زیادہ مرتکب ہو رہے ہیں۔ بیرونی اداروں کے نصابات رائج کرنے اور ان کے امتحانات میں طلبہ کو بٹھانے پر کوئی قدغن نہیں۔ بیرونی یونیورسٹیوں سے الحاق اور ان یونیورسٹیوں کے پاکستان میں ذیلی کیمپس کھولنے کی کھلی اجازت ہے۔

آئین پاکستان کی تعلیم سے متعلق شقیں اور ۱۹۷۶ء کا ایجوکیشن ایکٹ بالائے طاق رکھا جاچکا ہے۔ وزارت تعلیم، ہائر ایجوکیشن کمیشن اور اس طرح کے دوسرے ادارے بالکل غیر متعلق ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کے باوجود ہم ملکی استحکام کے خواب دیکھیں تو کیا چشم فلک ہماری حماقتوں پر آنسو نہیں بہائے گی؟ قوم کے اندر قوم پیدا کرنے کا یہ مسئلہ شاید کسی اور ذہین قوم کو اب

تک نہیں سوچھا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی ورلڈ بنک، ایشین ڈویلپمنٹ بنک، یونیسکو، یونیسف اور ترقی یافتہ ممالک کے امداد دینے والے دیگر ادارے نصاب، کتاب کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے رہے ہیں۔ اس دفعہ یلغار جنوب مشرق کی طرف سے نہیں شمال مغرب کی طرف سے ہوئی ہے۔ نصاب و کتاب اور تدریسی مواد کے سلسلہ میں صوبہ سرحد اور بلوچستان اپنے گورے آقاؤں کے ہاتھوں اپنی قسمت ہار چکے۔ پنجاب اور سندھ میں نفوذ جاری ہے۔ تعلیم کے ذریعے سیکولرازم کی ترویج، مغربی اقدار کا نفوذ اور خاندانی بندھنوں کی شکست وریخت ہمارے مغربی سرپرستوں کا ٹارگٹ ہے، جو وہ پوری دیدہ دلیری سے بیوروکریسی کے فراہم کردہ تحفظ میں انجام دے رہے ہیں۔ قومی استحکام کو دیمک کی طرح کھا جانے والی یلغار کہاں سرایت کر چکی ہے، اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کامیاب قومی زندگی محض سنگل ٹریک سوچ پر مبنی نہیں ہوتی۔ اختلافات، متبادلات، فکر ونظر میں جدت اور اختراع زندہ قوموں کی تعمیر وترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے بشرطیکہ قومی تعلیمی اور تربیتی نظام ان اختلافات اور متبادلات کے سلسلہ میں وسیع الفکری اور وسیع القلبی کا جذبہ پیدا کرے۔ کھلے ذہن کے ساتھ سائنسی تجربہ، دلائل اور اپنی رائے کو آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی رائے کا احترام اسلامی معاشرے کی لازمی صفت رہی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارا نظام تعلیم نہ جدید اداروں میں اس کو پروان چڑھاتا ہے اور نہ قدیم طرز کے دینی اداروں میں۔ اس نقطہ نگاہ کی وجہ سے ہم راوین، ایچی سونین اور دیوبندی و بریلوی تو پیدا کر رہے ہیں لیکن مسلمان اور پاکستانی آہستہ آہستہ ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔

تبادلۂ خیال اور مکالمہ کے کلچر کو فروغ دیا جائے۔ تعلیمی ادارے تبادلۂ خیال اور مکالمہ کے کلچر کو پروان چڑھانے کی نرسریاں ہوتی ہیں۔ انہیں ہم نے علاقائی، نسلی اور مسلکی گروہ بندی کے لیے کھلا چھوڑ دیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیمی اداروں میں کڑے نظم وضبط کے ساتھ آزاد علمی ماحول پیدا کیا جائے اور اس کے لیے طلبہ کونسل کا قیام اشد ضروری ہے جو تبادلۂ خیال اور مکالمہ کا ماحول مہیا کرتی ہے اور تعصّبات پر مبنی طلبہ کی گروبندیوں کا توڑ کرتی ہے۔ معاشرے میں عدل وانصاف کا قیام حکومت کی اولین ذمہ داری ہے لیکن بدقسمتی سے ہماری حکومتیں ہی اس کی دھجیاں بکھیرنے کا سبب بن رہی ہیں۔ عدل وانصاف کے معدوم ہونے سے انفرادی سطح پر ہر شخص بے یقینی اور عدم تحفظ کا شکار ہے۔ اور اجتماعی سطح پر قوم میں انتشار، افراتفری اور بے یقینی پیدا ہوتی ہے۔ سماجی انصاف کی خشت اول تعلیمی نصاب ہے۔

تعلیم کے ضمن میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں اجتماعی عدل وانصاف کا اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے۔ آئین کا آرٹیکل ۳۷ یوں رقمطراز ہے۔

371A. To Promote with special care the educational and economic interest of backward classes and areas.

371B. Remove illetracy and provide free and compulsory Secondary education within minimum possible period.

371C. Makes technical and professional education general and higher education equally accessible to all on the bases of merit.

اب ذرا دیکھیں کہ آئین کے پاسدار اداروں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ آرٹیکل 371B کے دستوری تقاضوں کے مطابق ۱۹۹۵ء میں میٹرک تک ہر قسم کی فیس ختم کردی گئی تھی لیکن مارشل لا کے خاتمہ کے بعد جمہوری حکومتیں دوبارہ آنے پر سکولوں میں فیس دوبارہ لاگو کردی گئی اور اب تو ان کا گراف اوپر ہی اوپر جارہا ہے۔ سنا ہے موجودہ نیک بخت حکومت بھی دستور کی اس شق کا مذاق اڑانے میں پیچھے نہیں رہنا چاہتی اور سکولوں کالجوں کی فیس بڑھانے کا معاملہ زیر غور ہے۔ آرٹیکل 371C جو تمام طبقات کے لیے اعلیٰ تعلیم کی دستیابی اور میرٹ کی بنا پر قابل حصول ہونے کی یقین دہانی کراتا ہے اب زرداروں کے ہاتھوں میں کھلونا بنادیا گیا ہے جہاں قرضے دینے والے بیرونی ادارے ہائر ایجوکیشن پر Surcharges نافذ کرنے پر مجبور کررہے ہیں وہاں خودسرکاری اداروں نے سلف فنانسگ کا تحفہ دے کر اعلیٰ تعلیم کو زرداروں کی لونڈی بنادیا ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ ہائر ایجوکیشن کے بارے میں equally excessible to all on bases of merit کا آئینی اصول اس صورتِ حال میں کہاں باقی رہا ہے؟

رہی سہی کسر ملازمتوں میں کوٹہ سسٹم نے نکال دی ہے جب عدل وانصاف کا معیار یہ رہ جائے گا کہ پاکستان کو نوخیز کلیوں نے مستقبل کا فیصلہ دادا کی جائے پیدائش پر استوار ہونا کوٹہ سسٹم قرار پائے تو نئی نسل کے ذہین نوجوان خواتین وحضرات استحکام وطن کے لیے جانوں کے نذرانے پیش کریں گے یا اپنے دادا بابا کو کوسیں گے کہ وہ خاکم بدہن کس سرزمین بے آئین میں اپنا اور اپنے اداروں کا مستقبل بنانے آئے تھے۔ انفرادی وگروہی سطح پر عدل اجتماعی کی نفی نے مستقبل کے متعلق بے یقینی پیدا کردی ہے۔ علامہ اقبال کے مطابق ۔

ہے غلامی سے بد تر بے یقین

یہ غلامی سے بدتر صورتِ حال نسلوں کو تعمیر سے زیادہ تخریب کی طرف راغب کرتی ہے۔ اگر عدل وانصاف کا دور دورہ ہو، صداقت اور ذہانت کی بنیاد پر آگے بڑھنے کے راستے کھلے ہوں تو خوشحال مستقبل سے متعلق یقین میں پختگی آتی ہے۔ انسان کی روحانی، سماجی، معاشی جڑیں سرزمین وطن میں گہری ہوتی چلی جاتی ہیں اور ذہین اور باصلاحیت انسانوں کی شکل میں تن آور درخت استحکام وطن کے لیے ہر قسم کی عریاں کاری سے بچاتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے سرسبز درخت زمین کو عریاں کاری سے محفوظ کر کے اسے بنجر ہونے سے بچاتے ہیں۔ ذہین اور باصلاحیت افراد کی ذہانت اور صلاحیت وہبی بھی ہوتی ہے اور کسبی بھی۔ علم اور اہل علم ذہانت اور صلاحیت کو صیقلکرتے ہیں اور اسے پروان چڑھاتے ہیں۔ اسے اظہار کی مثبت راہیں مہیا کرتے ہیں۔ اور یہ اہل علم ودانش ہی ہیں جو افراد قوم کو بھی اور قوم کے رہنماؤں کو بھی غلط روی اور غلط کاری پر ٹوکتے ہیں۔ اہل علم ودانش ایسی بریکوں کا کام کرتے ہیں جو نہ صرف قوم کی گاڑی اور قوم کی رہنماؤں کے ٹائی راڈ کھل جانے کے باوجود اسے اپنی بصیرت وحکمت سے اسے جانکاہ حادثوں سے بچا لیتے ہیں۔ اگر کسی معاشرے میں علم ودانش اور اہل علم ودانشوروں کو بے توقیر کر دیا جائے، ان کا احترام تو کجا انہیں بے عزتی اور چھوٹے پن کے احساس سے دوچار کیا جائے تو وہ معاشرہ تباہی، انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کی آخری حدود کو چھوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہماری بدقسمتی کی اصل وجہ یہی ہے کہ ہمارے معاشرے میں علم اور اہل علم کی توقیر ختم کر کے رکھ دی گئی ہے۔ زندہ قوموں میں بڑے بڑے زور آور قوم کے علما و اساتذہ کے سامنے اپنے گردنیں جھکا دیتے ہیں۔ ان سے رہنمائی کے طلب گار ہوتے اور ان کی زیرک باتوں کو اپنے دامن میں سمیٹتے ہیں لیکن یہاں ریونیو کلکٹرز اور امن وامان قائم کرنے کی Specialization کے حامل ماہر تعلیم بنا کر اہل علم اور عاملین درس وتدریس کے سروں پر بٹھا دیئے جاتے ہیں اور پوری تعلیمی اور انتظامی مشینری کا یہ صاحبانِ اقتدار سرچشمہ قرار پاتے ہیں اور درس وتدریس میں زندگیاں گزارنے اور تحقیق وجستجو میں عمریں کھپانے والے ان نام نہاد ماہرین تعلیم کا بے موضوع بیان سننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہمارا نظام تعلیم اب تک ایسے افراد کی کھیپ کیوں تیار نہیں کر سکا جو آگے بڑھ کر قوم کے ہر شعبہ زندگی کی قیادت کرتے؟ ہم اب تک علم وتحقیق میں کیوں معجزاتی کارنامے سرانجام نہیں دے سکے؟ اس کی محض ایک وجہ ہے کہ اگر

تعلیم گاہیں بھی تھانے اور تحصیل کی طرز پر آنسو گیس اور لاٹھی چارج کی سوچ پر چلائی جائیں تو ان سے حریت فکر کے پاسبان واساتذہ کیسے پیدا ہوں گے؟ معاشرے میں جن کی توقیر ہوگی اور ابلاغ عام کے ذریعے سے جنہیں پورے فخر کے ساتھ عزت ووقار کے تاج پہنائے جائیں گے اور ملک کے اندر جس قسم کے ٹیلنٹ کی حوصلہ افزائی ہوگی وہی ٹیلنٹ نشوونما پائے گا۔ہم دیکھتے ہیں کہ ناچیے، گویّے، بھانڈ اور میراثی اس قوم کی آنکھوں کا تارا ہیں۔حسن کارکردگی کے سارے ایوارڈ ان کے لیے ہیں۔حاملان اقتدار کی ساری شفقت ان پر نچھاور ہے اور میڈیا تو ان کے بغیر ادھورا ہو رہا ہے۔وہ کون سا اخبار یا رسالہ ہے جو شوبز کے نام پر قیمتی کاغذ ضائع نہیں کرتا۔ تمام خفیہ اوزاروں سے مسلح تصویریں اور ان کے ساتھ بے معنی تحریریں نوجوانوں کے ذہن پر عورت کا بھوت سوار کرنے اور شوبز کا کاروبار اور شوبز کے کاروبار کو من پسند بنانے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔عزت واحترام اور حوصلہ افزائی کے ان معیارات کی روشنی میں اہل علم ودانش کی حیثیت کیا ہوگی؟ اس صورت حال میں تعلیم اور اہل تعلیم کے ہاتھوں استحکام وطن کے معجزوں کی توقع کرنا خام خیالی سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء واساتذہ دانشور ترویج علم وتحقیق میں مشغول اصحاب قوم کو زندگی کی ہر سطح پر اہمیت دی جائے۔ان کی خدمات کو سراہا جائے اور ان کے ٹیلنٹ کو قومی اور ملی استحکام کے لیے کام میں لایا جائے۔

آخر میں آیئے یہ دیکھتے ہیں کہ کیا کیا جائے۔یہ بھیانک صورت حال جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے، اس کا حل کیا ہے تاکہ استحکام وطن کا مقدس فریضہ سرانجام دیا جاسکے۔ اس سلسلہ میں محترم وزیراعظم اور دیگر قائدین قوم کی خدمت میں صرف ایک گزارش پیش کروں گا اور وہ یہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے پورے دستور پر مکمل طور پر عمل کیا جائے۔صرف ایک شق ہی اس میں نہیں ہے کہ نوے روز میں الیکشن کرانا ضروری ہے۔ پورا آئین ہی ہمارے لیے مقدس ہے اور اگر سر دست ایسا ممکن نہ ہو تو تدریج عدل کے طور پر آرٹیکل ۱۳۱اور ۳۷پر ان کی پوری روح کے مطابق اخلاص کے ساتھ عمل درآمد کیا جائے۔میں حکومت کو یقین دلاتا ہوں کہ ان آرٹیکلز پر عمل درآمد اتنے دوررس اثرات پیدا کرے گا کہ پھر کبھی احتساب کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔

تعلیم و تربیت پروفیسر عاصم حفیظ

ہماری یونیورسٹیوں میں کیا ہورہا ہے؟

قادیانیوں سے اظہارِ یکجہتی کے لیے لمز (LUMS) کے طلبہ کا دورۂ ربوہ

لاہور کی مینیجمنٹ سائنس کی معروف یونیورسٹی LUMS کے طلبہ نے پچھلے دنوں قادیانی کمیونٹی سے اظہارِ یکجہتی کے لیے ربوہ کا دورہ کیا جس کی تصویر سوشل میڈیا پر وائرل ہوچکی ہے۔ عاطف میاں کی تعیناتی اور یوم دفاع پر قادیانیوں کے اشتہار، پی ٹی وی کے پروگرام پر ردعمل اور دیگر واقعات کے باعث قادیانی مسئلہ ملک میں ایک بار پھر ابھر کر سامنے آیا جس پر لمز کے ایک استاد کی رہنمائی میں یہ وفد ربوہ پہنچا۔ سوال یہ ہے کہ مینیجمنٹ یونیورسٹی کے طلباء کو دینیات کے مسائل میں الجھانے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک تفریحی دورے کے نام پر ان طلبہ و طالبات کو مظلومیت اور جبر و ستم کی کہانیاں تو سنائی گئی ہوں گی لیکن کیا لمز کی انتظامیہ ان اشکالات کو دور کرنے اور دینی طبقے کا اس بارے میں موقف واضح کرنے کے لیے کسی مستند عالم دین کا لیکچر رکھنے کی بھی اجازت دے گی؟ کیا کبھی LUMS کے طلبہ کا ٹُور (Tour) کسی مدرسے میں بھی گیا ہے جہاں پر ان نوجوان طلبہ و طالبات کے ذہنوں میں سیکولرازم اور ماڈرن ازم کے نام پر جو اشکالات پیدا کئے جارہے ہیں ان کا ازالہ ہوسکے؟ سب سے بڑھ کر یہ بھی کہ آئین پاکستان کی رو سے قادیانیوں کو تبلیغ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس طرح ٹُور لے کر جانا کیا قادیانیت کی تبلیغ نہیں؟ کئی نوجوان ان رابطوں سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ کیا کسی اسلامی تنظیم یا مدرسے کا ٹور بھی ربوہ جاسکتا ہے جو وہاں کی نوجوان کمیونٹی سے بات چیت کرکے ان کو تبلیغ کرے؟ اگر ایسا ممکن نہیں تو کیوں ملک کو ایک نئی بحث اور انتشار کی جانب دھکیلا جارہا ہے؟

یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ مملکت خداداد پاکستان جو اسلام کے نام پر وجود میں آئی اور جس کا دستور قرآن حکیم، علوم اسلامیہ اور عربی زبان کی تدریس کو فروغ دینے کا تقاضا کرتا ہے، اور ریاست سے یہ تقاضا بھی کرتا ہے کہ وہ پاکستانی مسلمانوں کو اس قابل بنائے کہ وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گزار سکیں، اس میں ہماری یونیورسٹیاں پاکستان کے مسلمان بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کس رُخ میں کررہی ہیں؟

تزکیۂ نفس مدیر (استفادہ از حافظ محمد موسیٰ بھٹو)

تزکیۂ نفس اور جدید اسلامی تحریکیں
جدیدیت کے پس منظر میں

گزارشِ احوال واقعی

تعلیم وتزکیہ یا دوسرے لفظوں میں صحیح تعلیم اور متوازن تزکیہ ہر زمانے میں مسلم معاشرے کی ضرورت اور اس کا بنیادی موضوع رہے ہیں۔ اور یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ علم وتقویٰ ہی مسلم معاشرے میں عزت اور وقار کا معیار رہے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہماری نااہلی اور مغربی تہذیب کے ملحدانہ اثرات کو قبول کرنے کی وجہ سے ہمارے آج کے مسلم معاشرے میں دولت وحکومت اور منصب وشہرت وغیرہ کو معیارِ عزت ووقار بنالیا گیا ہے۔ اگر علم وتقوی ہی معیارِ عظمت ہوں تو ہمارے نزدیک حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب ہماری قوم کے چند چوٹی کے لوگوں میں شمار ہوں گے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے چند ایسی خصوصیات عطا فرمائی ہیں جن کا اجتماع بہت کم کسی شخصیت میں نظر آتا ہے۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے اوائل عمر ہی میں ایک جدید دینی تحریک (جماعت اسلامی) کی فکر کو سمجھا اور اس کے ساتھ مل کر عملی جدوجہد کی۔ پھر وہ تزکیہ وتصوف کی طرف مائل ہوئے اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ مرحوم جیسے فاضل مربی کی طویل صحبت اور ان سے تربیت پانے کا موقع انہیں ملا۔ تیسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مغربی فکر وتہذیب کے خلافِ اسلام ہونے اور اہل مغرب کی مسلمانوں سے دشمنی کا انہیں گہرا شعور بخشا اور چوتھی بات یہ کہ انہیں رواں قلم عطا فرمایا اور انہوں نے مندرجہ بالا موضوعات پر غالباً سو سے زیادہ وقیع کتابیں لکھی ہیں اور ہر ماہ اردو اور سندھی میں بیداری کے نام سے دو ماہنامے باقاعدگی سے شائع کر رہے ہیں۔

ہمیں حافظ موسیٰ بھٹو صاحب کے اس موقف سے مکمل اتفاق ہے کہ آج امت مسلمہ کے گھمبیر مسائل کا بنیادی سبب ان کی تزکیۂ نفس سے غفلت اور محرومی ہے اور اس کا حل بھی قرآن حکیم کے الفاظ میں تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس کے کام کو بنیادی اہمیت دینا ہے۔ تاہم

ہمارے اوران کے اسلوب بیان میں تھوڑا سا فرق ہے۔ وہ لوگوں کو'تصوف' کی طرف بلاتے ہیں اور تصوف کی مخصوص زبان اور لہجہ استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ غلط نہیں ہے کیونکہ تصوف وہ ادارہ ہے جو مسلمانوں نے تزکیۂ نفس کے لیے بنایا۔ اس کا وجود ایک تاریخی حقیقت ہے جو آج بھی موجود ہے اوراس کا انکار فضول ہے اور ویسے بھی اصطلاحات کا معاملہ اہل علم کے نزدیک توسع کا طالب ہوتا ہے اور اصل اہمیت اصطلاح کی پشت پر موجود فکر اور تصور کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ اگر صحیح ہو تو کسی مخصوص اصطلاح پر اختلاف محض ایک لفظی اختلاف ہے جس پر جھگڑنا بے فائدہ ہے۔

بایں ہمہ لوگوں کو، خصوصاً سلفی الفکر حضرات، جدید دینی تحریکوں سے وابستہ افراد اور مغرب سے متاثر جدید پڑھے لکھے حضرات کو، جو ہمارا بڑا حلقۂ دعوت ہے، 'تصوف' کی طرف بلانے کو ہم موزوں نہیں سمجھتے بلکہ اس کے لیے 'تزکیۂ نفس' کی اصطلاح کو موزوں سمجھتے ہیں اور ہم ان لوگوں کا یہ دعوی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ 'تزکیۂ نفس کے لیے قرآن وسنت کافی ہیں' اوران کو یہ بتاتے ہیں کہ قرآن وسنت ہمارے نفس کا تزکیہ کس طرح کرتے ہیں....اور پھران سے کہتے ہیں کہ قرآن وسنت کی تعلیمات کی رہنمائی کے باوجود اگر کوئی شخص اپنے نفس کا تزکیہ نہ کرسکے اور معصیت سے نہ بچ سکے یا درجۂ احسان نہ حاصل کر سکے تو پھر وہ کیا کرے؟ یہاں ہم ان کو بتاتے ہیں کہ ہمارے عظیم اسلاف میں سے محقق علماء وصلحاء نے شرعی اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے 'علاجِ نفس' کے جو طریقے وضع کیے ہیں، ان کو آزمانے میں آخر کیا حرج ہے؟ یوں ہم اس شعبے میں داخل ہوجاتے ہیں جو 'تصوف' کا دائرہ کار ہے۔ لیکن یہاں بھی ہم ان رسوم ورواج کی مخالفت کرتے ہیں جو خلاف شریعت ہیں اور قرآن وسنت سے مستنبط ضوابط، مباحات اوراجتہادات تک محدود رہتے ہیں جو نقل وعقل پر مبنی ہیں....اور یہ بہت موثر ہیں اور مسئلے کا حل ہیں۔

خیر، یہ تو ایک ضمنی بحث تھی جو درمیان میں آ گئی۔ ہم کافی عرصے سے محسوس کررہے تھے کہ محترم حافظ موسیٰ بھٹو صاحب 'تصوف' کے نام سے جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ بہت موثر ہے۔ بس اگر اس میں سے لفظ 'تصوف' کو نکال کر اس کی جگہ 'تزکیۂ نفس' لکھ دیا جائے اور اسی لحاظ سے بعض دوسرے الفاظ کو بھی تبدیل کر دیا جائے۔ یہ اسی طرح کی ایک چیز ہوگی جیسے ہماری علمی

روایت میں حواشی لکھے جاتے تھے اور اس میں بعض دفعہ مصنف اور محشی میں اختلاف رائے بھی ہوجاتا تھا۔ ہم نے اس کے عملی نمونے کے طور پر 'بیداری' اکتوبر ۲۰۱۸ء میں حافظ موسیٰ بھٹو صاحب کے شائع شدہ مضمون 'تصوف اور دینی تحریکیں' کو چنا ہے اور مذکورہ تبدیلیوں کے بعد وہ حاضر خدمت ہے۔ ہم نے حافظ موسیٰ بھٹو صاحب کے مضمون میں جو تبدیلیاں کی ہیں انہیں نسخ میں لکھا ہے تاکہ ان کی نشاندہی رہے۔

اگر حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب کو ہماری اس 'مداخلت' پر اعتراض نہ ہوا اور 'قارئین' کو بھی یہ سلسلہ ٹھیک لگا تو ہم کبھی کبھار اس طرح کے مضامین دیتے رہیں گے کیونکہ 'تزکیۂ نفس' البرہان کا ایک باقاعدہ موضوع ہے جس کے لیے ہمیں مناسب مواد کی تلاش رہتی ہے۔ ہم یہ بھی واضح کردیں کہ موجودہ صورت میں مضمون کی ذمہ داری ہماری ہے نہ کہ حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب کی۔ مدیر

تزکیۂ نفس اور جدید اسلامی تحریکیں بہت اہم موضوع ہے۔ تزکیۂ نفس کی جدوجہد امت کا تیرہ سو سالہ سرمایہ ہے جو قرآن وسنت پر مبنی ہے جب کہ جدید اسلامی تحریکیں بھی ہمارے لیے ایک اعتبار سے سرمایہ ہیں کہ وہ دین و مذہب سے دُور اور جدیدیت سے متاثر افراد کی ذہنی و علمی تربیت کرکے انہیں اسلام کے لیے متحرک کرتی ہیں اور فروغ اسلام کے لیے ان کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرتی ہیں۔

سب سے پہلے اس نکتہ کا استحضار ضروری ہے کہ زوال پذیر دور میں امت کے سارے ادارے زوال کے اثرات کی زد میں آتے ہیں، اس لیے کہ زوال کے ہمہ گیر و ہمہ جہتی اثرات سے بچنا غیر معمولی طور پر دشوار ہوتا ہے۔ یہ بات ہمارے دور کی تزکیۂ نفس کی کوششوں اور اسلامی تحریکوں پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ اس وقت تصوف کے نام پر دکانداری کی روش عام ہوگئی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ حقیقی اہل اللہ بھی موجود ہیں۔ جو اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ اصلاح نفس کے خواشمند افراد کی اصلاح کا فریضہ بھی سرانجام دے رہے ہیں۔ اسی طرح جدید اسلامی تحریکوں میں اپنی ذاتی اصلاح کے سلسلہ میں بے فکری اور ریاستی نظام میں سیاسی اور انقلابی تبدیلی کی باتیں غالب ہوگئی ہیں۔ تاہم اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلامی تحریکوں میں کافی افراد ایسے موجود ہیں جو ذاتی اصلاح کے سلسلہ میں خود

احتسابی سے کام لینے کے لیے کوشاں ہیں اور افرادِ معاشرہ کی اسلام سے ہم آہنگی کے کام کو اہم سمجھتے ہیں اور اسلامی تحریکوں میں رہتے ہوئے وہ کسی حد تک یہ کام کر بھی رہے ہیں۔

موجودہ دور میں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ تزکیۂ نفس اور اسلامی تحریکوں کے درمیان پیدا شدہ دوری کو کم تر کرنے اور ان میں باہمی قربت پیدا کرنے کی کوشش ہو لیکن اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ایک تو تزکیۂ نفس کے علم برداروں کو عام طور پر دورِ جدید کے چیلنج اور اس کی نوعیت کو سمجھنے میں دشواری درپیش ہے۔ دوسرے یہ کہ اسلامی تحریکوں کے اہداف ایسے ہیں جن میں خارجی زندگی میں جدوجہد کا کام دین کے نصب العینی کام کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، جس کی وجہ سے اس فکر سے وابستہ افراد کے لیے نفس کی منفی قوتوں، دل کی گہرائیوں، اللہ سے والہانہ محبت، انسانی شخصیت کی غیر معمولی وسعتوں، تہذیب نفس اور تزکیۂ نفس کے کام کی نوعیت کو سمجھنا مشکل ہو گیا ہے۔ نیز وہ فکری و نظریاتی اصلاح اور حاکمیت الٰہیہ کے کام سے آگے بڑھ کر، اسلامی اعتبار سے دوسرے اہم دینی کاموں کو فیصلہ کن اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں۔ ان دشواریوں کی وجہ سے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ معاشرے میں ایک ایسا طبقہ وجود میں آئے جو اہل تزکیہ سے اکتساب فیض کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی تحریکوں سے فکری و نظریاتی طور پر استفادہ کرے تاکہ معاشرے کو مادیت کے ہولناک سیلاب سے بچانے کے سلسلہ میں روحانی قوتوں کے ساتھ ساتھ علمی اور فکری صلاحیتوں سے بھی بہرہ وری کی صورت پیدا ہو۔

اہل تزکیہ کے اہداف

اب آئیے اہل تزکیہ اور اسلامی تحریکوں کے اہداف پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اہل تزکیہ کے اہداف یہ ہیں:

اللہ سے اپنے تعلق کو مستحکم کرنا، اللہ کی رضا کے احساس وجذبہ کا غالب سے غالب تر ہونا، ہر سنت پر عمل پیرا ہونے کے لیے طبعی آمادگی کا ہونا، اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونے کا آسان ہونا بلکہ حلاوت کا حاصل ہونا، حمیت دین کا ہونا، ظاہری اور باطنی نوعیت کے باطل سے بیزاری کا ہونا، اللہ کے سامنے جواب دہی کے احساس کا غالب ہونا، محاسبۂ نفس کے عمل کا مسلسل جاری

رکھنا، فکر آخرت کا غالب ہونا، عاجزی اور انکساری اختیار کرنا، دنیا و اہل دنیا سے بے نیازی کا ہونا، آخرت کو کل کا نہیں آج کا مسئلہ سمجھنا، اللہ کے بندوں سے محبت کرنا، زندگی بھر کے معاملات کا اسلام سے ہم آہنگ ہونا اور اپنی استطاعت اور صلاحیت کے تحت دعوتی کام کرتے رہنا۔

اہل تزکیہ کے یہ سارے اہداف شریعت کی روشنی میں صحبت صالح اور کثرت ذکر کے ذریعے آسانی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اہل اللہ کی صحبت اور کثرت ذکر ہی وہ محرک ہیں جن سے مذکورہ مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔ صحبت صالح کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں سوا لاکھ انبیاء کرام مبعوث فرمائے جب کہ کل کتابیں اور صحیفے ۱۰۴ ہیں۔ اللہ کی یہ سنت بتاتی ہے کہ انسانوں کی اصلاح کے سلسلہ میں صحبت صالح ہی فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ کتاب سے بنیادی تعلیمات اور اصول حاصل ہوتے ہیں جب کہ نیک اعمال کی استعداد و قوت صالح شخصیتوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے۔ صحبت اہل اللہ وہ چیز ہے جو فرد کو ذکر و فکر کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔

اسلامی تحریکوں کے اہداف

اہل تزکیہ کے اہداف معلوم کرنے کے بعد، اب اسلامی تحریکوں کے اہداف پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے جدوجہد کرنا، جدیدیت کے چیلنج کے مقابلے کے لیے کام کرنا، افراد کی فکری اور ذہنی تربیت کے لیے کوشاں ہونا، ہر طرح کے خارجی باطل کے خلاف جہاد کی حِسّوں کا تیز تر ہونا، دل کے مقابلے میں ذہنی صلاحیتوں کو بیدار کرتے رہنا، اصلاح نفس کے کام کے لیے لٹریچر اور وعظ و نصیحت کی باتوں کو کافی وشافی سمجھنا، عبادت، ذکر و فکر، اللہ کی محبت، سیرت اور تزکیہ کے کاموں کو مقصود سمجھنے کی بجائے اسے نظام کی تبدیلی اور ریاستی سطح پر اقامت دین کے کام کا ذریعہ سمجھنا، جدید نشریاتی ذرائع، لٹریچر، اخبارات اور میڈیا سے کام لے کر غلبۂ اسلام کے لیے فضا کو ہموار کرنا، اسلام کو نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کرتے رہنا، مغربی تہذیب اور مغربی افکار سے بیزاری کی فضا پیدا کرنے کے لیے کوشاں

ہونا، اسلامی تحریکوں کے یہ اہداف ایسے ہیں جن سے ایک تو اسلامی نظام فکر وعمل کی ترتیب متاثر ہوئی ہے۔ دوسرے یہ کہ اسلام کی اُس نصب العینی فکر میں تبدیلی واقع ہوئی ہے جو چودہ سوسال سے سلف صالحین پیش کرتے رہے ہیں۔ یہ نصب العینی فکر وتعلیمات جدید اسلامی مفکرین کی کتابوں میں موجود ہیں اور یہ اس کے برعکس ہیں، جسے علمائے امت اب تک پیش کرتے رہے ہیں۔ اسلامی فکر کی ترتیب میں تبدیلی اور خارجی زندگی میں جدوجہد کا نصب العینی کام کی حیثیت اختیار کرنا، یہ دو چیزیں ایسی ہیں جن پر اب تک ہزاروں صفحات لکھے گئے ہیں۔ عبادت اور ذکر وفکر میں انہاک نہ ہونا، ہولناک نفسی قوتوں کا عدم ادراک اور اہل تزکیہ سے دوری کا ہونا، یہ اس فکر کے لازمی اثرات ہیں۔ اس فکر کا ایک اثر یہ ہوا ہے کہ اسلامی تحریکوں سے وابستہ افراد میں باہم محبت کی بجائے رنجشیں، کدورتیں اور چھوٹے چھوٹے مسائل پر دوری کی خلیج پیدا ہوگئی ہے۔ جب باطن کی گہرائیوں میں نفسی کدورتیں موجود اور غالب ہوں گی تو کارکنوں کے باہمی تعلقات میں محض وعظ ونصیحت اور لٹریچر کے ذریعہ بہتری کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی۔

اہل تزکیہ واسلامی تحریکوں کے فہم اسلام میں فرق

اہل تزکیہ واسلامی تحریکوں کے درمیان فہم اسلام کے سلسلہ میں فرق کی نوعیت کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ دونوں کے درمیان ایک فرق تو یہ ہے کہ اہل تزکیہ چودہ سوسالہ سلف صالحین اور علمائے ربانیین کی اسلامی فکر وتعلیمات کے تسلسل کے امین ووارث ہیں۔ وہ سلف کے دین کے نصب العینی تعین اور فرائض وواجبات کی ترتیب میں تغیر وتبدل کے قائل نہیں، جب کہ اسلامی تحریکیں دور جدید کے کسی ایک آدھ مفکر کے فکر کا حاصل ہیں۔ ان کی دین کی نصب العینی تشریح، ان کے قرآن وسنت کے ذاتی مطالعہ کا حاصل ہے۔ حالانکہ امت کے چودہ سوسالہ فکری وعملی تسلسل کا حامل ہونا، ان کی فکر کو تھامے رہنا، یہ دراصل [illegible] الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ' کی قرآنی تعلیمات پر گامزن ہونا ہے۔ امت کے علمائے ربانیین کے تسلسل کے مقابلے میں ایک آدھ مفکر کی سوچ میں غلطی کا بہت زیادہ احتمال ممکن ہے جب کہ ربانی علماء کی عظیم اکثریت کا اتفاق لگ بھگ اجماع امت کے مترادف ہے۔ (جاری ہے)

اسلام اور پاکستان　　مدیر

سیکولر عدلیہ کا ایک اور وار

اسلامی رجحانات اور عدلیہ۔ملٹری گٹھ جوڑ کے خلاف بولنے پر عدالت عالیہ کے ایک جج کی نوکری ختم

جسٹس شوکت عزیز صدیقی صاحب اسلام آباد ہائی کورٹ کے سینئر جج تھے۔ وہ اپنے فیصلوں میں اسلامی جذبات اور رجحانات کا برملا اعلان کرتے تھے، انہیں چھپاتے نہ تھے۔ یہ ’جرم‘ ہماری سیکولر عدلیہ کے نزدیک خاصا خطرناک ہے۔ ان سے دوسری غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے عدلیہ۔ملٹری غیر اعلانیہ گٹھ جوڑ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور ملٹری سے متعلق امور میں ان کے خلاف بلا جھجکے ڈرے فیصلے سنائے۔ ان کی یہ دونوں غلطیاں عدلیہ قیادت اور اسٹیبلشمنٹ کے لیے ناقابل برداشت تھیں چنانچہ ان کے خلاف سپریم جیوڈیشل کونسل حرکت میں آ گئی اور انہیں ملازمت سے برخواست کر دیا گیا۔

اس سے پہلے ۲۰۱۳ء میں ججز پارلیمانی کمیٹی میں شاہد ندیم صاحب ایڈوکیٹ کو اس لیے منتخب کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا کہ وہ حافظ قرآن تھے اور ان میں غیر متوازن اسلامی رجحانات پائے جانے کا امکان ہوسکتا تھا۔ مطلب یہ کہ ایک حافظ قرآن جج نہیں بن سکتا لیکن ایک ہندو بھگوان داس اور ایک عیسائی کارنیلیئس مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان کی اعلیٰ عدلیہ کا جج بن سکتا ہے۔ پھر اگر ہم اسے سیکولر عدلیہ کہتے ہیں تو اس میں غلط کیا ہے؟ ہم جسٹس شوکت صدیقی صاحب کے حامی نہیں۔ انہوں نے ممتاز قادری شہیدؒ کے خلاف جو فیصلہ دیا تھا وہ ہمیں اب تک یاد ہے لیکن جن الزامات میں انہیں نکالا گیا ہے ان کے بارے میں شاعر بہت پہلے کہہ گیا ہے کہ ان کا اصل جرم یہ ہے کہ ؎

اکبر خدا کا نام لیتا ہے اس زمانے میں

اسلام اور پاکستان مدیر

نا قابل تصور، ہولناک اور شرمناک جنسی جرائم

ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

ہمارے حکمران، علماء کرام، اساتذہ اور والدین کب خواب غفلت سے جاگیں گے؟

لاہور میں پچھلے ہفتے میں دو ایسے ہولناک اور نا قابل تصور جنسی جرائم ہوئے جن کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ایک خاوند کو اس کی بیوی نے وڈیو ثبوتوں کے ساتھ حوالۂ پولیس کرا دیا کہ وہ اپنی ۵ سالہ اور ۹ سالہ بیٹیوں کے ساتھ جنسی زیادتی کرتا تھا۔ اور ایک ۱۸ سالہ بیٹی نے اپنے باپ کی جنسی زیادتی سے بچنے کے لیے چوتھی منزل سے چھلانگ لگا دی اور انتہائی مخدوش حالت میں ہسپتال پہنچ گئی۔

یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ ہمارا معاشرہ دین سے دوری اور اخلاقی گراوٹ کی اس پست ترین سطح کو چھو رہا ہے کہ اس سے زیادہ پستی کا تصور نہیں کیا جا سکتا لیکن ہر سو ایک بے حسی طاری ہے۔ میڈیا کی فحاشی و عریانی اور مخلوط تعلیم جنسی جذبات کو نقطۂ ابال تک لے جا رہی ہے لیکن ہمارے حکمران بے خبر بیٹھے ہیں۔ انہیں اپنی سیاسی لڑائیوں اور اقتدار کے جھمیلوں سے فرصت نہیں اور عوام کی اخلاقی بے راہروی ان کا مسئلہ ہی نہیں۔ علماء کرام، صوفیائے عظام اور دینی عناصر کی ترجیحات پتا نہیں کیا ہیں؟ اساتذہ اور والدین کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں۔ والدین سمجھتے ہیں کہ انہوں نے بچوں کو سکول داخل کرا کر گویا اپنا فرض ادا کر دیا اور اساتذہ سبق پڑھا کر سمجھ بیٹھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی ڈیوٹی نبھا دی۔ انسان سازی، تربیت، تزکیۂ نفس، تعمیر سیرت اور کردار سازی ایسے الفاظ ہمارے حافظوں سے یوں محو ہو گئے ہیں جیسے یہ کبھی ہمارے ذخیرۂ الفاظ کا حصہ ہی نہ تھے۔

افسوس یہی نہیں کہ ہمارے اخلاق برباد ہو گئے، افسوس اس بات کا بھی ہے کہ احساس زیاں جاتا رہا۔ جو عزتوں کے محافظ تھے وہ عزتوں کے لیٹرے بن گئے لیکن کسی آنکھ سے لہو نہیں ٹپکتا۔ حکمران، علماء، دینی عناصر، اساتذہ، والدین کہیں سے تڑپنے کی صدا نہیں آتی!

یا اللہ! ہمارے حال پر رحم فرما۔

اسلام اور مغرب

پروفیسر راحیل اعظم

’قومی ریاست‘ اور ’قوم پرستی‘ کے مغربی تصورات

اُمہ اور اس کی روایات و مفادات کو تباہ کر رہے ہیں

یورپ کا دنیا کے لیے مہلک ترین تحفہ قومی ریاست (Nation State) اور قوم پرستی (Nationalism) تھا۔ اس کی ایک مہلک ترین شکل مذہبی قوم پرستی اور عالم اسلام میں مسلم قوم پرستی تھی۔ یعنی ’سب سے پہلے میری قوم‘ کے اصول کے تحت دنیا کا ہر مسلم ملک مشرف کی طرح یہی کہتا ہے کہ سب سے پہلے پاکستان۔

قوم پرستی کے اس مغربی اصول کے تحت ہر قومی ریاست اپنے معاشی، مالی، مادی اور افادی مفاد کو ہر شے پر مقدم رکھتی ہے۔ مسلم قوم پرستی نے مسلمانوں کو امت کی جامعیت سے نکال کر قومیت کے دائرے میں محدود، محصور، مقید کر دیا لہٰذا اب تمام مسلم قومی ریاستوں کا کام صرف اپنی ترقی ہے، اس کے سوا انہیں کسی دوسرے کام سے کوئی تعلق نہیں۔ ترکی، سعودی عرب، پاکستان اور عالم اسلام کے تمام ممالک اور ان کے حکمران، مذہبی جماعتیں، عوام، علماء سب مسلم قوم پرستی کے تحت بڑے بڑے حادثات پر خاموش رہتے ہیں۔ سعودی عرب میں علماء پر کیا گزر رہی ہے؟ اسلام کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ چین مسلمانوں پر کیا ظلم کر رہا ہے؟ یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔

قوم پرستی کے نتیجے میں ان حادثات و سانحات کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ چین نے ستمبر میں ۲ لاکھ مسلمانوں کو گرفتار کر کے حراستی کیمپوں میں بند کر دیا۔ مغربی پریس ان کی تعداد دس لاکھ بتا رہا ہے۔ چین کہہ رہا ہے کہ ہم نے ان کو تربیتی کیمپ میں رکھا ہے۔ وہاں ان کو اسلام کے خلاف تربیت دی جا رہی ہے۔ چین نے مسلمانوں کی مسجد گرانے کی کوشش کی تو ایک لاکھ چینی مسلمان آ گئے اور کہا کہ ہماری لاشوں کے اوپر سے گزر کر ہی مسجد گرائی جا سکتی ہے مگر پورا عالم اسلام خاموش ہے۔ دنیا بھر کی اور پاکستان کی مذہبی جماعتیں چپ ہیں۔ اقوام متحدہ میں ترکی، سعودی عرب کوئی قرارداد تک پیش نہیں کر رہا ہے۔ قومی مفادات اور قومی ریاست کے تقاضے یہی ہوتے ہیں۔ چین کے خلاف کوئی مظاہرہ نہیں

ہوا، بیان تک نہیں آیا۔ چین امریکہ کی جگہ لے رہا ہے لہٰذا اب چین کی تقلید کرنا ہوگی۔

۲۔ امریکہ نے سعودی صحافی کے قتل پر سعودی عرب کو دھمکی دی تو جواب ملا کہ امریکہ نے پابندیاں لگائیں تو ایران سے دوستی کرلیں گے، روسی فوج کو ملکی حفاظت کی دعوت دیں گے اور چینی کرنسی میں تیل فروخت کریں گے (۱۶/اکتوبر ۲۰۱۸ء جنگ کراچی)۔ ٹرمپ کے ساتھ ناچنے والے سعودی حکمران جو ایران سے بات کرنے کو تیار نہ تھے اب ایران سے دوستی کے لیے تیار ہیں۔ یہ رویہ جدیدیت کا پیدا کردہ قومی رویہ ہے کہ مفاد بدلے تو دوست بدل لو۔

۳۔ چین نے برمی مسلمانوں پر ظلم کی حمایت کی۔ اقوام متحدہ میں برما کے خلاف قرارداد ویٹو کرنے کی دھمکی دی پورا عالم اسلام چپ رہا۔ اردوان، پاکستان، پاکستانی علماء، پاکستانی مذہبی جماعتیں کسی نے چین کی مذمت میں ایک لفظ نہیں کہا کہ سی پیک سے ہمیں فائدہ تھا ہمارا قومی مفاد یہی تھا کہ ہم چپ رہیں۔ یہی مذہبی قوم پرستی ہے۔

۴۔ شاہ سلیمان کو ولی عہد بنانے کے بعد سعودی عرب میں علماء کے ساتھ کیا ہوا؟ اسلام کے ساتھ کیا ہوا؟ یہ عالم اسلام اور پاکستان کا موضوع نہیں کیوں کہ سب کو سعودی عرب سے امداد مل رہی ہے۔ پانچ سال تک بغیر قیمت کے تیل مل رہا ہے تو ہمیں اس سے کیا کہ سعودی عرب میں کیا ہورہا ہے؟ یہ ہمارے دینی رویے اور دینی فکر ہے۔

۵۔ عمران خاں نے کہا تھا IMF سے قرض لینے سے بہتر ہے کہ خودکشی کرلوں مگر اب وہ خودکشی نہیں کررہے کہ اسلام میں خودکشی حرام ہے۔ اسد عمر کہہ رہے ہیں کہ قرضے ادا کرنے کے لیے قرضے لینے ہوں گے۔ دنیا کے سامنے مَیں کشکول لے کر پھر رہا ہوں، ۲ ارب ڈالر ماہانہ خسارہ ہے گیس کی قیمت نہ بڑھاتے تو کمپنیاں بند ہوجاتیں۔ IMF کے بغیر ہم ترقی نہیں کرسکتے۔ قرضے ڈالر سے ادا ہوتے ہیں وہ ہم چھاپ نہیں سکتے۔ IMF سے قرض لینے سے دس لاکھ لوگ بے روزگار ہوتے ہیں۔ نج کاری کریں تو بے روزگاری بڑھے گی۔ سرکاری ادارے کا انتظام اچھا ہو تو یہ منافع بخش ہوسکتے ہیں۔ (اسد عمر جنگ کراچی ۱۶/۱۱ کتوبر ۲۰۱۸ء)

اس تفصیل سے آپ جدید قومی ریاست اور ترقی کی آفتوں سے بخوبی آگاہ ہوسکتے ہیں۔ ان میں تمام مباحث، مقدمات، مسائل، معاملات مشکلات سموئی ہوئی ہیں، صرف دیدۂ بینا کی ضرورت ہے جو ان کو سمجھ سکے۔

سعودی عرب سے امریکہ نے ایک سال پہلے جب تاریخی معاہدہ کیا صدر بش اور سعودی شہنشاہ تلواریں پکڑ کر روایتی گانے گا کر امت کے سامنے ناچ رہے تھے تو ہم نے عرض کیا تھا کہ ایران اور سعودی عرب امریکہ سے تو بات چیت کر سکتے ہیں مگر آپس میں کیوں نہیں کر سکتے؟ امریکہ ایک جانب عرب ممالک کو ایرانی خطرے سے ڈراتا ہے دوسری جانب ایران سے بیک ڈورڈپلومیسی بھی کرتا ہے لہٰذا سعودی عرب کو عالم عرب کے مسائل حل کرنے کے لیے خصوصاً شام، یمن وغیرہ کا مسئلہ ایران سے مل کر حل کرنا چاہیے لیکن سب خاموش رہے کیونکہ سب امریکہ کے مقلد ہیں۔

اب امریکہ نے سعودی صحافی کے قتل پر سعودی عرب کو سخت سزا کی دھمکی دی ہے تو یہی سعودی عرب جو پچاس سال سے امریکہ کا آلہ کار بنا ہوا ہے چینی کرنسی، روسی فوج اور ایران سے دوستی کی باتیں کر رہا ہے۔ یعنی قومی ریاست کا کوئی اصول نہیں۔ اس کا اصول بس دنیاوی ترقی اور معاشی و مادی فائدہ ہے۔ اس کی خاطر دوست دشمن بدلتے رہتے ہیں کوئی دوست مستقل نہیں ہوتا۔ لہٰذا منافقت ہی جدید ریاست کا مذہب ہے۔ امریکہ سے خطرہ ہوا تو ایران چین روس یاد آ گئے۔ کیا امت مسلمہ کفار کی مدد سے ترقی کر کے اللہ کی نظر میں سرخرو ہو سکتی ہے؟ یہ ہے بنیادی سوال۔ یہ کون سا کفر ہے جو اسلام کو مضبوط کرنے کے لیے قرضے دے رہا ہے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کفر و اسلام کے عقیدے جدید قومی ریاست نے ختم کر دیے اور صرف ترقی کا عقیدہ قوموں کو دے دیا ہے۔ پوری دنیا کا مشترکہ متفقہ مذہب عقیدہ 'ترقی' ہے۔ ہماری تمام وفاداری اسی اصول کے تابع ہے۔ سعودی عرب کا رویہ، ترکی کی روس سے دوستی، پاکستان کی چین سے دوستی سب ترقی کے تناظر میں ہیں۔ سعودی عرب نے کہا کہ امریکہ ہم سے تعلقات ختم کر کے اپنے پیروں پر کلہاڑی مارے گا۔ [جنگ کراچی، ۱۵؍اکتوبر ۲۰۱۸ء]

سعودی عرب یہ بتا رہا ہے کہ ہم سے تعلقات خراب کرو گے تو معاشی نقصان اٹھاؤ گے۔ یہی بات امریکہ پوری دنیا کو بتا رہا ہے کہ ہماری بات نہیں مانو گے تو ہم تمہاری ترقی میں تعاون نہیں کریں گے، تمہیں غریب کر دیں گے۔ قوموں کے درمیان دوستی کی بنیاد صرف ترقی اور قومی مفادات ہیں۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۵۸)

فہم دین　　　　ڈاکٹر محمد امین

فکری افلاس یا امت سے غداری؟

جاوید احمد غامدی غلام احمد قادیانی کے نقشِ قدم پر

راقم ایک دفعہ کچی عمر میں قادیانیوں کے نرغے میں آ گیا۔ یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے جب میری عمر ۱۸ سال کے لگ بھگ تھی۔ انٹر کامرس کے بعد مجھے فوراً واپڈا میرپور آزاد کشمیر میں ملازمت مل گئی اور وہاں رہائشی کالونی کے بیچلر کوارٹرز کے ایک کمرے میں رہائش بھی مل گئی۔ قریب ہی رہائش پذیر ایک صاحب سے آتے جاتے علیک سلیک ہوئی اور ایک دن انہوں نے مجھے عصر کے بعد چائے کی دعوت دی جو مَیں نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد قبول کر لی۔ کمرے میں روشنی کم تھی، اے سی کی وجہ سے کمرہ خوب ٹھنڈا تھا، فرنیچر عمدہ تھا اور کمرے میں ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ سچی بات ہے مَیں اس فضا سے مرعوب ہوا کیونکہ میں نے ہوش سنبھالا تو گھر میں عسرت دیکھی۔ مَیں جس گاؤں سے آیا وہاں بجلی ہی نہ تھی اور جہاں میری اس وقت رہائش تھی وہاں کئی افراد رہتے تھے اور پنکھے چلتے تھے۔ ان صاحب سے تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ وہ محکمے میں تحصیل دار ہیں اور اس کمرے میں اکیلے رہتے ہیں۔

پھر وہ اکثر مجھے چائے پہ بلانے لگے جس میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں، مستقبل کی پلاننگ، ترقی کے جھلملاتے خواب اور ان میں معاونت۔ مطالعہ کا شوق ہے؟ کیا پڑھتے ہیں؟ ایک مرتبہ وہ مجھے کچھ دوستوں سے ملانے شہر کے دوسرے حصے میں لے گئے۔ وہاں بھی میری خوب خاطر مدارت ہوئی۔ درس قرآن ہوا، دینی باتیں ہونے لگیں اور یہ بھی بتایا گیا کہ لوگ خواہ مخواہ ہمارے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں ہم تو سیدھے سچے مسلمان ہیں اور مرزا صاحب کی رہنمائی میں دین پر عمل کرتے ہیں.... یوں کئی مہینوں کی میل ملاقات کے بعد اس دن مجھے پتہ چلا کہ یہ لوگ قادیانی ہیں۔ مجھے پڑھنے کے لیے کچھ چیزیں دی گئیں اور آتے رہنے کا وعدہ لیا گیا۔ بہر حال مَیں چوکنا ہو گیا۔ میرے گھر کا ماحول مذہبی تھا، مَیں قادیانیوں سے واقف تھا اور ان کے بارے میں عام مسلمانوں کی رائے بھی جانتا تھا اگرچہ دین کا گہرا علم اس وقت حاصل نہ تھا اور نہ مَیں نے کسی مسلمان عالم سے اس وقت رابطہ کیا کہ نئی جگہ تھی، پہلی

دفعہ گھر سے باہر نکلا تھا اور ماحول سے موانست نہ تھی۔ میں نے تحصیل دار صاحب سے کہا کہ وہ مجھے مرزا صاحب کی اپنی کتابیں دیں تا کہ پتہ چلے کہ ان کی بنیادی فکر کیا ہے؟ انہوں نے مجھے مرزا صاحب کی کتابیں اور پمفلٹ مہیا کر دیے۔ میں نے وہ مواد پڑھنے کے بعد ایک ذہن بنالیا اور ایک دن عصر کے بعد تحصیل دار صاحب سے ملنے چلا گیا اور کتابیں انہیں واپس کر دیں۔ وہ مجھ سے ان کتابوں اور مرزا صاحب کے بارے میں میرے تاثرات دریافت کرنے لگے۔ مَیں نے کہا: مَیں مرزا صاحب کو نبی تو کیا ایک اچھا انسان بھی ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ وہ ہکا بکا رہ گئے اور پوچھنے لگے کیوں؟ مَیں نے کہا: دو باتوں کی وجہ سے۔ ایک تو ان کی زبان بڑی گندی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ مسیح (علیہ السلام) کی نانیاں دادیاں کسبیاں تھیں اور یہ کہ جو مجھے نہیں جانتے اور میری مخالفت کرتے ہیں وہ گونہہ کھانے والے ہیں۔ مَیں نے کہا مَیں نے یہ لفظ گونہہ (بمعنی انسانی فضلہ، پاخانہ) زندگی میں پہلی دفعہ مرزا صاحب کے کتابچے میں لکھا ہوا دیکھا ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں انگریزوں کی حمایت کرتے ہیں۔ جب انگریزوں کو ترکوں کے خلاف جنگ میں فتح حاصل ہوئی اور انہوں نے کئی بڑے ترکی شہروں پر قبضہ کر لیا تو مرزا صاحب نے اپنے پیروکاروں کو حکم دیا کہ وہ اظہار خوشی کے لیے قادیان میں گھی کے چراغ جلائیں اور وہ جلائے گئے۔ میں نے کہا ہندوستان میں مسلمان مغلوب ومظلوم تھے اور انگریز غاصب اور مسلمانوں کے دشمن، جنہوں نے مسلمانوں کو غلام بنا رکھا تھا تو جس شخص کی زبان اتنی گندی ہو اور جو اپنی مظلوم وغلام قوم کی بجائے اس کے دشمن اور اسے غلام بنانے والے استعمار کی حمایت کرے، وہ اچھا انسان ہی نہیں کجا کہ اسے پیغمبر مانا جائے۔ یہ کہہ کر مَیں اٹھ کر آ گیا اور دوبارہ کبھی اس طرف نہیں گیا۔

راقم کو یہ واقعہ اس لیے یاد آ گیا کہ حال ہی میں اسے جاوید احمد غامدی صاحب کی وہ تقریریں اور تحریریں سننے اور دیکھنے کو ملی ہیں جن میں وہ غلام احمد قادیانی کی حمایت کرتے ہیں اور غلام احمد قادیانی کی طرح مسلمانوں کے مقابلے میں اہل مغرب کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ اس بات کے لیے دینی استنباط مہیا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ غلبہ واقتدار اب قیامت تک کے لیے اہل مغرب کا حق ہے اور مسلمان اپنی باری لے چکے گویا اب محکومیت، غلامی، پسماندگی اور ذلت ان کا مقدر ہے اور وہ اسی کے مستحق ہیں۔

وہ ایک وڈیو کلپ میں غلام احمد قادیانی کی حمایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نبوت کا جس

طرح کا دعویٰ غلام احمد قادیانی نے کیا ہے اس طرح کی عبارتیں تو ابن عربی اور حضرت مجدد سرہندی جیسے صوفیاء کے ہاں بھی موجود ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ عبارتیں جن کی بھی ہیں، غلط ہیں لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ محض روحانی تعلّی کی باتیں ہیں کیونکہ ان میں سے کسی نے

۱۔ نبوت کا دعویٰ نہیں کیا یعنی وہ مدعی نبوت بن کر کھڑا نہیں ہوا۔

۲۔ اس نے اپنی نبوت کی بناء پر امت کو نہیں توڑا اور اپنی الگ اجتماعیت قائم نہیں کی۔

۳۔ اور اس نے یہ سب کچھ کفار کی شہ پر نہیں کیا اور مسلمانوں کے مقابلے میں غاصب کفار کی حمایت نہیں کی۔

۴۔ اور کسی نے ترک جہاد کا فلسفہ پیش کر کے امت کو غلبۂ کفار کو قبول کرنے کی اور غلامی کا درس دینے کی کوشش نہیں کی۔

جب کہ یہ 'کارنامے' صرف غلام احمد قادیانی نے سرانجام دیے ہیں لہٰذا ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ جاوید احمد غامدی، غلام احمد قادیانی کی حمایت کر رہے ہیں اور اس کے گناہ کو ہلکا بنا کر پیش کر رہے ہیں تا کہ اسے امت کی شماتت کا نشانہ بننے سے بچا سکیں۔

یہ فکر غامدی صاحب کے ہاں اتنی پختہ ہے کہ ان کے تلامذہ بھی اسی راستے پر چل پڑے ہیں۔ اکتوبر ۲۰۱۸ء کا ماہنامہ 'الشریعہ' اس کا زندہ ثبوت ہے جس میں عمار ناصر صاحب یہ مفروضہ قائم کرتے ہیں کہ اگر کوئی ایسا موقع ہو کہ قادیانیوں کا اہل کفر سے مقابلہ ہو تو پھر تو مسلمانوں کو قادیانیوں ہی کی حمایت کرنی چاہیے۔ اور اپنے ایک دوست سے مضمون لکھوایا ہے کہ عاطف میاں کے حوالے سے جمہور نے قادیانیت کے خلاف جو طوفان اٹھایا ہے اس میں حق کس کے ساتھ ہے؟ مطلب یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح قادیانیت کے بارے میں مسلمانوں کے موقف میں نرمی پیدا کی جائے اور یوں بالواسطہ طور پر قادیانیت کی حمایت کی جائے کیونکہ کھلم کھلا قادیانیوں کی حمایت کرنا نہ استاد کے لیے ممکن ہے اور نہ تلامذہ کے لیے۔

قادیانی جیسا طرز عمل

سوچنے کی بات یہ ہے کہ غامدی صاحب غلام احمد قادیانی کے جرم کو جو اسلام سے بغاوت اور اس کے انہدام کی سازش سے کم تر درجے کا جرم نہیں اور جس کے بارے میں امت

اور اس کے علماء کا اجماع ہے کہ وہ ارتداد اور خروج از اسلام ہے، ہلکا بنا کر کیوں پیش کرتے ہیں؟ اور یہ کہنے کی جسارت کیوں کرتے ہیں کہ قادیانی تو قرآن کو بھی مانتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو بھی۔ وہ صرف خاتم النبیین کے لفظ کی ایسی تاویل کرتے ہیں جو دیگر علماء سے ذرا مختلف ہے تو ایسا اختلاف تو ہمارے علماء کا روز مرہ کا معمول ہے اور اس طرح کے تفردات بھی اہل علم میں عام ہیں۔ ہمارے اکابر صوفیاء بھی اسی طرح کی مقام نبوت تک پہنچنے کی باتیں کرتے رہتے ہیں.... مقصد یہ ہے کہ امت اور اس کے علماء کو قادیانیوں کو کافر قرار دینے، ان کی مذمت کرنے اور انہیں دشمن سمجھنے کے موقف میں نرمی پیدا کرنی چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ غامدی صاحب ایسا کیوں کر رہے ہیں؟

ہمارے نزدیک اس کی وجہ نفسیاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ خود بھی وہی کام کر رہے ہیں جو مرزا غلام احمد قادیانی نے کیا تھا یعنی امت پر مغرب کی فکری و عملی بالادستی تسلیم کرنا اور امت سے اسے منوانے کی کوشش کرنا، اس کے لیے جھوٹے سچے دلائل وضع کرنا، اہل مغرب کے خلاف امت کی مزاحمت کو غیر شرعی قرار دینا، اسلامی تعلیمات میں کتر بیونت کر کے انہیں مغربی فکر و تہذیب کے مطابق بنانا اور امت کو ترغیب دینا کہ وہ مغربی استعمار کی بالادستی کو تسلیم کر لے.... اور اس کے ساتھ وہ چاہتے ہیں کہ امت اُن کے اِن افکار سقیمہ کو قبول کر لے، انہیں معتبر اور شرعی سمجھے اور شمشیر بکف مغرب کے قدموں میں گر جائے کہ جناب گردن حاضر ہے!.... اور وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ امت اور اس کے علماء اُن کے اِن افکارِ سقیمہ کو برا نہ سمجھیں اُن کو اس پر ملامت نہ کی جائے، اُن کے خلاف محاذ نہ کھڑا کیا جائے اور ان پر گمراہی، فسق اور کفر کے فتوے نہ لگائے جائیں.... لیکن جناب! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جب آپ پتھر پھینکیں گے تو پانی میں تموج تو پیدا ہوگا۔ جب آپ عمل سے باز نہیں آ رہے تو ردّ عمل کیسے نہ ہوگا؟

دلیل کا تقاضا

غامدی صاحب کے بارے میں جو گفتگو ہم کر رہے ہیں، اس حوالے سے بعض احباب اس پر اصرار کرتے ہیں کہ ان کی دلیل کا جواب دلیل سے دینا چاہیے اور جذباتی ہونے اور فتوے کی زبان سے گریز کرنا چاہیے۔ ہم اس بات سے اصولی طور پر اتفاق کرتے ہیں لیکن مغرب کی عقلیت پرستی کے تناظر میں اس کے حجت اور سند ہونے کو تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا کہ [illegible] اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا انکار کرنے والوں کو باریکیاں چھانٹنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ ان سے کہو کیا تمہارے سامنے میری گزاری ہوئی زندگی اُس کی گواہی کے لیے کافی نہیں؟ اور ہمارے فقہاء کہتے ہیں کہ اگر کوئی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بنوت کا دعوی کرے تو وہ کافر ہے اور اگر وہ کہے کہ میرے پاس اس کے دلائل ہیں میری بات سنو۔ تو جو اس کے دلائل سنے (یعنی ان میں صحت کا امکان تسلیم کرے) تو وہ بھی کافر ہے۔

متجددین جو افکارِ سقیمہ پیش کرتے ہیں ان کے دلائل کا ردّ کیا جاسکتا ہے جس طرح مثلاً غامدی صاحب اور عمار ناصر صاحب کے دلائل کو سید خالد جامعی صاحب، ڈاکٹر محمد زبیر صاحب اور زاہد صدیق مغل صاحب دلائل سے ردّ کرتے ہیں لیکن ہمارا ذاتی ذوق اس سے اباء کرتا ہے۔ ہم نے ایک دو دفعہ ان پر قلم اٹھایا ہے تو ان کے دلائل کا شرعی ردّ کرنے کی بجائے صرف اتنا لکھا ہے کہ ان کا موقف وہی ہے جو مغرب کا ہے اور مغربی فکر و تہذیب الحاد و دہریت پر مبنی ہے۔ اور اس فکر و تہذیب کے علمبردار اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں لہٰذا غامدی صاحب کی فکر اور دلائل کو ردّ کرنے کے لیے اتنی دلیل ہی کافی ہے اور دیگر تفصیلی دلائل کی ضرورت نہیں۔

عمار ناصر صاحب نے ایک دفعہ ہمیں اپنی ایک 'تحقیق' دکھائی کہ بیت المقدس پر یہودیوں کا حق فائق ہے، مسلمانوں کا نہیں، اور ہم سے اس 'تحقیق' پر تبصرہ کرنے کو کہا۔ ان کا موقف غلام احمد قادیانی کے انگریزوں کی حمایت کرنے والے موقف کی طرح اتنا کراہت انگیز تھا کہ ہمیں اس پر ان کے 'دلائل' پر غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔

اس ضمن میں ہمارا موقف وہی ہے جو علامہ اقبال کا تھا۔ وہ غلام احمد قادیانی کے موقف کو نہ صرف 'فکری افلاس' سے تعبیر کرتے تھے بلکہ اسے امت سے غداری بھی قرار دیتے تھے۔ ہم بھی جاوید احمد غامدی صاحب کے موقف کو غلام احمد قادیانی کے موقف جیسا ہی سمجھتے ہیں اور اسی لیے اسے فکری افلاس اور امت سے غداری سے تعبیر کرتے ہیں۔ غلام احمد قادیانی اور جاوید احمد غامدی کے موقف میں جو یکسانی اور ہم آہنگی ہے اس کا کچھ ذکر ہم اوپر کر چکے لہٰذا اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

فہم دین ڈاکٹرمحمد امین

ریاستِ مدینہ

پاکستان کی دینی قوتیں کیوں مدینہ جیسی ریاست قائم نہیں کرسکیں اور کرواسکیں؟

[لاہور ایوان اقبال میں تنظیم اسلامی کے سیمینار منعقدہ ۱۴/اکتوبر ۲۰۱۸ء میں مدیر البرہان کے خطاب کی جھلکیاں]

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا

پاکستان میں مروج جمہوریت اپنی اصل میں مغرب کی سیکولر، لبرل اور سرمایہ دارانہ جمہوریت ہے۔ یہی اس کا مزاج ہے۔ چنانچہ ہماری سیاسی جماعتیں اور ہمارے سیاسی رہنما بنیادی طور پر سیکولر، لبرل اور سرمایہ دارانہ نظام کے علم بردار ہیں۔ نواز شریف صاحب علی الاعلان اپنے معاشرے کو لبرل بنانے کے اعلان کرتے رہے۔ زرداری صاحب نے ایک سیاسی معاہدے کی خلاف ورزی پر ڈنکے کی چوٹ کہا کہ ''یہ ایک سیاسی معاہدہ تھا۔ قرآن کا حرف نہیں کہ میں نے اسے بدل نہیں سکتا'' مطلب یہ کہ قرآن الگ ہے اور سیاست الگ۔ مشرف صاحب جدید روشن خیالی (Enlightened Moderation) کے علم بردار تھے۔ یہی حال عمران خان صاحب کا ہے کہ ان کی ساری تعلیم و تربیت، معاشرت اور سوچ سیکولر اور لبرل ہے۔

ہاں! ہمارے یہ حکمران چونکہ مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں اور مسلم معاشرے میں پروان چڑھے ہیں لہٰذا مسلمانی کا ایک آدھ نشان اگر ان کی شخصیت میں باقی رہ گیا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اور چونکہ ان کے ۹۸ فیصد ووٹر مسلمان ہیں اور جذباتی مسلمان ہیں لہٰذا ان کے ووٹ لینے کے لیے یہ اپنی بچی کھچی اسلامیت کا اظہار اپنے سیاسی مفاد میں سمجھتے ہیں تاہم یہ بھی آٹے میں نمک کی طرح برائے نام اور بروزن بیت ہوتا ہے۔ جیسے بھٹو صاحب نے کہا تھا کہ جمہوریت ہماری سیاست ہے، سوشلزم ہمارا معاشی نظام ہے اور اسلام ہمارا مذہب ہے۔ اسی طرح عمران خان صاحب نے فرض کیجیے دس ہزار الفاظ پر مشتمل تقریر کی اور اس کے آخر میں دو لفظ 'ریاست مدینہ' کے بھی بول دیے تو اس سے یہ سمجھنا کہ وہ پاکستان کی ریاست کو مدینہ جیسی ریاست بنانے کا کوئی سنجیدہ پروگرام رکھتے ہیں، سادگی اور سادہ لوحی ہے۔ یہ سمندر

سے مچھلی پکڑنے کی کوشش ہے کہ آپ دس ہزار الفاظ میں سے دو لفظ اپنی پسند کے چنیں اور انہیں لے اڑیں۔

توقع، مگر کن سے

سچ پوچھیے تو مجھے کبھی زرداری صاحب سے توقع نہیں رہی کہ وہ اسلامی نظام نافذ کریں گے، نہ نواز شریف سے مَیں نے کبھی امید باندھی کہ وہ اسلامی انقلاب لائے گا اور نہ مَیں نے عمران خان سے کبھی توقع کی کہ وہ اس سرزمین پر نظام مصطفیٰ قائم کرے گا۔ ان لوگوں نے کبھی اس کا وعدہ اور دعویٰ بھی نہیں کیا۔ لیکن مَیں حافظ عاکف سعید صاحب، سراج الحق صاحب، مولانا فضل الرحمن صاحب اور اویس نورانی صاحب سے اسلامی انقلاب، نظام مصطفیٰ اور نفاذ شریعت کی توقع کیوں نہ رکھوں کہ آپ لوگوں نے اس کے نعرے لگائے، وعدے کیے اور ہمیں یہ بتایا کہ آپ اس کے اہل ہیں، آپ یہ کر سکتے ہیں۔ تو آپ مجھے بتایئے کہ آپ پاکستان کو مدینہ جیسی ریاست کیوں نہیں بنا سکے؟ سوچیے، غور کیجیے اور ہمیں کچھ تو بتایئے!

مطالباتی سیاست بے سود ہے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا کام حکومت کو یاددہانی کرانا ہے لہٰذا ہم مطالبہ کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے کہ عمران خان صاحب پاکستان کو مدینہ جیسی ریاست بنائیں۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ اس مطالباتی سیاست کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ پچھلے بہتّر (۷۲) سال سے یہ مطالباتی سیاست کر رہے ہیں۔ آپ کے بعض مطالبات منظور بھی کر لیے گئے مثلاً اس مملکت خداداد میں حدود قوانین ۱۹۷۹ء سے نافذ ہیں لیکن آپ دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے کہ ان انتالیس (۳۹) سالوں میں کتنے چوروں کے ہاتھ کٹے؟ کتنے زانی رجم ہوئے؟ کتنے شرابیوں کو کوڑے لگے؟ ایک کو بھی نہیں۔ کیوں؟ ذرا سوچیے اور ہمیں بھی بتایئے!

ناکامی کیوں؟

خلافت ٹوٹنے کے بعد دینی عناصر میں سے بعض نے سوچا کہ اصل چیز تو طاقتور اسلامی ریاست کا قیام ہے لہٰذا انہوں نے حکومت الٰہیہ کا نعرہ لگاتے ہوئے کہا کہ اسلام ہماری سیاست ہے اور ہماری سیاست عین اسلام ہے۔ بعض نے کہا کہ کلمہ سیدھا کرانا اور نماز پڑھنا

کافی ہے، سیاست فضول چیز ہے۔ پھر آپ نے مغرب کی الحادی اور لادین جمہوریت کو اسلامی انقلاب کا ذریعہ بنایا اور ابھی تک کولہو کے بیل کی طرح متحرک ہیں لیکن تلوں میں سے تیل ہے کہ نکل ہی نہیں رہا۔ پھر ہر فرقے نے اپنی ''دینی سیاسی جماعت'' بنائی، آپس میں لڑائی کی، دین کی بدنامی کا سبب بنے اور ناکامی کا تاج سر پر سجایا۔ لوگ مولوی صاحب کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں لیکن اسے ووٹ نہیں دیتے! کبھی آپ نے سوچا؟ کیوں؟ اور ان ساری ''حکمت عملیوں'' کی ناکامی کا ذمہ دار کون ہے؟

مدینہ کی ریاست کیسے بنی؟

آپ مدینہ کی ریاست کو موضوع بحث بنا رہے ہیں۔ کبھی آپ نے سوچا کہ مدینہ کی ریاست کیسے وجود میں آئی تھی؟ دنیا کے سب سے بڑے آدمی (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے تیرہ (۱۳) سال محنت کی، شب و روز جان توڑ محنت کی۔ کتنے افراد تیار ہوئے؟ تقریباً ۱۵۰ (کہ بدر میں انصار سمیت ۳۱۳ تھے)۔ مدینہ کی ریاست قائم کرنے والے اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تھے تو ان کے دست و بازو ابوبکر و عمر اور عثمان و علی (رضی اللہ عنہم) جیسے لوگ تھے۔ دیکھو! تاریخ کا سبق اور نبی کا اسوہ یہ ہے کہ پہلے آدمی کو بدلو۔ جو نظریۂ حیات تم لے کر اٹھے ہو اس کے مطابق آدمی کو بدلو تو اس نظریے کے مطابق معاشرہ بھی قائم ہو جائے گا اور ریاست بھی۔

کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے شعب ابی طالب میں بھوک میں گھلتے اور طائف کی گلیوں میں پتھر کھاتے کبھی کہا تھا کہ میں یہ اس لیے کر رہا ہوں کہ میں ایک ریاست قائم کرنا چاہتا ہوں! غور کرو! میرے نبی کے ایک ایک لمحے کی کہانی قرطاس پر رقم ہے، تم اس بارے میں ایک لفظ نہیں دکھا سکتے کہ میرے نبی نے کہا ہو کہ یہ ساری جدوجہد میں اس لیے کر رہا ہوں کہ میں ایک ریاست قائم کرنا چاہتا ہوں۔ ہرگز نہیں! آپ نے اللہ کی مدد سے اور اپنی محنت سے آدمیوں کو بدلا تاکہ وہ اللہ کے بندے بن جائیں، ایسے بندے جن کا ہدف آخرت کی کامیابی ہو اور جن کا ہدف دنیا میں انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ کی مرضی کے مطابق بسر کرنا ہو۔ جب ایسے آدمی آپ نے تیار کر دیے تو پھر اسلامی معاشرہ بھی قائم ہو گیا اور مدینہ کی ریاست بھی۔

لیکن تم، تم آدمی کو بدلے بغیر مدینہ جیسی ریاست قائم کرنا چاہتے ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم نبی کے اسوہ کے خلاف جا کر مدینہ جیسی ریاست کیسے قائم کر سکتے ہو؟ یہ مغرب زدہ، سیکولر اور

لبرل جج اور وکیل، یہ بیوروکریٹ، یہ فوج، یہ پولیس، یہ سول سوسائٹی تمہیں مدینہ جیسی ریاست قائم کرنے دے گی اور چلانے دے گی؟ سوچو! غور کرو!

آدمی کو کیسے بدلا جائے

اب رہا یہ سوال کہ آدمی کو کیسے بدلا جائے؟ تو اس کا نسخہ اللہ نے قرآن میں اپنے نبی کو چار دفعہ بتایا ہے [illegible] اسے آج کی اصطلاح میں کہتے ہیں تعلیم وتربیت یعنی قرآن کی تعلیم، قرآن پر مبنی تعلیم اور قرآن کے مطابق تزکیۂ نفس۔ تم اپنی آج کی تعلیم وتربیت کے نظام کو دیکھو تو تمہارے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ تمہارا جدید تعلیم کا نظام مغرب کی پیروی میں اچھے باعمل مسلمان نہیں دو ٹانگوں کے جانور پیدا کر رہا ہے۔ تمہارا 'دینی مدرسے' کا نظام صدیوں پہلے کے ایسے متون طلبہ کو رٹوا رہا ہے اور ایسا فرد پیدا کر رہا ہے جس کی آج کے عصر سے کوئی Relavance ہی نہیں۔ تمہارے تزکیے کا نظام ایسے جاہل تصوف فروش گدی نشینوں کے ہاتھ میں ہے جنہیں نہ تزکیے کا پتا ہے اور نہ نفس کا۔ تو تم آدمی کو کیسے بدلو گے!

سوچو! غور کرو! اپنے نظام تعلیم وتربیت کو بدلو تا کہ وہ آدمیوں کو بدل سکے۔ اگر تم نے یہ کام نہ کیا تو اس کا نتیجہ ہوگا دنیا اور آخرت دونوں کی ناکامی اور رسوائی۔ جب تک فرد اسلامی نہ ہوگا، معاشرہ کیسے اسلامی ہو سکتا ہے اور ریاست کیسے اسلامی ہو سکتی ہے اور کیسے مدینہ جیسی ریاست قائم ہو سکتی ہے؟

اگر تم یہ نہیں کرو گے تو تمہیں، پاکستان کی ریاست کا اقتدار مل بھی جائے تو تم کچھ نہیں کر سکو گے۔ تمہیں ایک صوبے میں اختیار ملا تھا، تم نے کیا کر لیا؟ اگر مرکز میں بھی مل جائے تو تم کچھ نہیں کر سکو گے کیونکہ تمہارے پاس اس کی اہلیت رکھنے والے آدمی نہیں۔ تم 'اسلامی نظام تعلیم' کا مطالبہ کرتے تھے۔ اتفاق سے ریاست نے تمہیں اس کی اجازت دے دی۔ آج تمہارے پاس ہزاروں سکول اور بیسیوں کالج اور یونیورسٹیاں ہیں جو 'مغرب کا مطلوب آدمی' تیار کر رہی ہیں۔ قرآن کا مطلوب انسان نہیں۔ تمہارے پاس پچیس (۲۵) ہزار دینی مدرسے ہیں جو راکھ کا ڈھیر ہیں، تم ان میں وہ آدمی گھڑ کر تیار نہیں کر رہے جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیار کیے تھے۔ سوچو! غور کرو! تم مدینہ جیسی ریاست کیسے قائم کرو گے اور کرواؤ گے؟

دینی تحریکیں

عبداللطیف خان گنڈاپور[۱]

ارکانِ جماعتِ اسلامی کی توجہ کے لیے

دستوری تقاضوں کے مطابق ارکانِ جماعت کو انتخابِ قیادت میں موثر کردار ادا کرنا چاہیے
سوال یہ ہے کہ ارکان یہ موثر کردار کس طرح ادا کر سکتے ہیں؟

[ہمیں سندھ کے معروف صوفی دانشور اور مصنف حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب نے مشورہ دیا ہے کہ دینی جماعتوں اور اداروں کے خلاف مستقل تنقیدی مضامین لکھنا دعوتی واصلاحی حوالے سے نقصان دہ ہے اس لیے اس سے احتراز مناسب ہے۔ہم البرہان میں لکھنے والوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس نصیحت پر غور فرمائیں۔انتخابات اکتوبر کے حوالے سے جماعت اسلامی اور دیگر دینی جماعتوں پر تجزیہ وتنقید کا یہ سلسلہ ختم کیا جارہا ہے۔مدیر]

میں اپنے پچھلے مضمون ''جماعتِ اسلامی۔انحطاط اور احیا''(مطبوعہ البرہان ستمبر ۲۰۱۸ء) میں ارکان جماعتِ اسلامی کی اہمیت و کردار اور مقامی وضلعی قیادتوں سے مرکزی قیادت اور مجالسِ شوریٰ کے انتخاب میں اُن کے چند غلط فیصلوں (جن کے جماعت اور ملک پر بہت ہی بُرے اثرات مرتب ہوئے) کی طرف چند اشارے کر چکا ہوں۔اور اسی مضمون میں عبوری مدت کے لیے جب تک کہ نئی قیادتیں منتخب نہیں ہو جاتیں، چند ابتدائی مگر دُور رس اثرات کے حامل اقدامات کی طرف بھی ارکان کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی تھی۔بہی خواہوں اور جماعت کے خیرخواہ دوستوں نے جماعت کی بہتری کے لیے ان تجاویز کو سراہتے ہوئے اُسے ملک کے کونے کونے میں بلکہ بیرون ملک تحریکی ساتھیوں تک پہنچایا۔نتیجہ کافی Feed back کے ساتھ یہ بھی تقاضا کیا جانے لگا کہ کچھ مزید لکھا جائے۔اور ارکان کے سامنے اُن کی ذمہ داریاں اور اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس وشعور لایا جائے تاکہ مستقبل میں وہ پورے شعور وآگہی کے ساتھ جماعت کی بہتری کے لیے سوچیں اور اقدامات کریں۔لہٰذا یہ چند سطور اُنہی کے حکم کے تحت پیش کر رہا ہوں کہ شاید اللہ تعالیٰ اُمید کی کوئی صورت پیدا فرمائے اور جماعت اس موجودہ بحران سے بخیر وخوبی عہدہ برآ ہو۔

---

[۱] سابق ناظم اسلامی جمعیت طلبہ صوبہ سرحد (KPK)

ارکانِ جماعتِ اسلامی ہی دراصل جماعتِ اسلامی کی عمارت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ committed کارکن ہیں جنہوں نے شعوری طور پر حلف اُٹھایا ہے کہ وہ دین کی اقامت کے لیے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ یہی وہ اصل سرمایہ ہے جس پر جماعتِ اسلامی کو ناز اور فخر ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو جماعت میں سب اہم عہدوں اور انتخاب میں اہم کردار بلکہ کلیدی کردار ادا کرتے ہیں؛ اور ماضی میں اکثر بحرانوں سے یہ لوگ بخوبی نبرد آزما ہونے میں سرخرو ہوئے ہیں۔

ارکانِ جماعت کی میرے نزدیک دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت جماعت کے مختلف درجوں کی قیادتوں اور اداروں کے لیے ایک انتخابی ادارہ کی۔ اور دوسری حیثیت جماعت کے کارکن اور داعی کی ہے۔ اس مضمون میں ہم صرف ارکان کی بطور انتخابی ادارہ کی حیثیت کا جماعتِ اسلامی کے دستور اور جماعت کے ابتدائی سالوں کی رودادوں اور بانی و امیر جماعت اور سرکردہ رہنماؤں کے بیانات اور تقاریر کی روشنی میں اس کا جائزہ لیں گے کہ جماعت کا دستور کیا چاہتا ہے اور ان ارکان نے جماعت کی پیش رفت اور اقامت دین کے لیے عملی اقدامات میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ (رکن کی حیثیت بطور داعی کے بارے میں ان شاءاللہ آئندہ کسی مناسب وقت پر گفتگو کریں گے)۔

دستور جماعتِ اسلامی میں تفصیل سے مذکور ہے کہ جماعت کی رکنیت، جماعت میں داخلے کا طریقۂ کار کیا ہوگا اور وہ کون سے تغیرات ہوں گے جو جماعت میں داخلے کے بعد ہر رکن جماعت کو بتدریج اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہوں گے۔

دستور جماعتِ اسلامی

دفعہ نمبر ۶: شرائط رکنیت:

ہر عاقل و بالغ شخص (خواہ وہ عورت ہو یا مرد اور خواہ وہ کسی ذات، برادری یا نسل سے تعلق رکھتا ہو) اس جماعت کا رکن بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ:

۱۔ جماعت کے عقیدے کو اس کی تشریح کے ساتھ سمجھ لینے کے بعد شہادت دے کہ یہی اس کا عقیدہ ہے۔

۲۔ جماعت کے نصب العین کو اس کی تشریح کے ساتھ سمجھ لینے کے بعد اقرار کرے کہ

یہی اس کا نصب العین ہے۔

۳۔ اس دستور کا مطالعہ کرنے کے بعد عہد کرے کہ وہ اس کے مطابق جماعت کے نظم کی پابندی کرے گا۔

۴۔ فرائضِ شرعی کا پابند ہو اور کبائر سے اجتناب کرتا ہو۔

۵۔ کوئی ایسا ذریعہ معاش نہ رکھتا ہو جو معصیتِ فاحشہ کی تعریف میں آتا ہو مثلاً سود، شراب، زنا، رقص و سرود، شہادتِ زُور، رشوت، خیانت، قمار وغیرہ

۶۔ اگر اس کے قبضے میں ایسا مال (یا جائیداد) ہو جو حرام طریقے سے آیا ہو یا جس میں حق داروں کے تلف کردہ حقوق شامل ہوں، تو اس سے دست بردار ہو جائے اور اہل حقوق کو ان کے حق پہنچا دے۔

تشریح: یہ عمل صرف اس صورت میں کرنا ہوگا جب کہ حق دار بھی معلوم ہوں اور وہ مال بھی معلوم و متعین ہو جس میں ان کا حق تلف ہوا ہے۔ بصورتِ دیگر توبہ اور آئندہ کے لیے طرزِ عمل کی اصلاح کافی ہوگی۔

۷۔ کسی ایسی جماعت یا ادارے سے تعلق نہ رکھتا ہو جس کے اصول اور مقاصد جماعت اسلامی کے عقیدہ، نصب العین اور طریقِ کار کے خلاف ہوں۔

نظمِ جماعت اس کے بارے میں مطمئن ہو جائے کہ وہ جماعت کی رکنیت کا اہل ہے۔

دفعہ نمبر ۷: طریقہِ داخلہ:

مذکورہ بالا شرائط کے مطابق جماعت میں داخلہ کا طریقہ یہ ہوگا کہ امیدوار رکنیت، امیر جماعت یا اس کے مقرر کیے ہوئے کسی مجاز شخص کے سامنے اس بات کا اقرار کرے کہ:

اولاً، اس نے جماعت کے عقیدے کو اس کی تشریح کے ساتھ اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور وہ اسے سمجھنے کے بعد اقرار کرتا ہے

اب پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ شہادت دیتا ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

ثانیاً، اس نے جماعت کے نصب العین کو اس کی تشریح کے ساتھ اچھی طرح سمجھ لیا ہے

اور وہ اسے سمجھنے کے بعد اقرار کرتا ہے کہ دنیا میں اللہ کے دین کو قائم کرنا، اس کی زندگی کا نصب العین ہے اور اسی نصب العین کے حصول کی سعی کے لیے وہ خالصتاً للہ جماعت اسلامی میں داخل ہو رہا ہے۔ اور اس کام میں اس کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کی رضا اور فلاحِ اخروی کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔

ثالثاً، اس نے دستورِ جماعت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور وہ عہد کرتا ہے کہ اس دستور کے مطابق وہ نظامِ جماعت کا پوری طرح پابند رہے گا۔

دفعہ نمبر ۸: فرائضِ رکنیت:

داخلہ جماعت کے بعد جو تغیرات ہر رکن کو بتدریج اپنی زندگی میں کرنے ہوں گے وہ یہ ہیں:

۱۔ دین کا کم از کم اتنا علم حاصل کر لینا کہ اسلام اور جاہلیت (غیر اسلام) کا فرق معلوم ہو اور حدود اللہ سے واقفیت ہو جائے۔

۲۔ تمام معاملات میں اپنے نقطۂ نظر، خیال اور عمل کو کتاب وسنت کی تعلیمات کے مطابق ڈھالنا، اپنی زندگی کے مقصد، اپنی پسند اور قدر کے معیار اور اپنی وفاداریوں کے محور کو تبدیل کر کے رضائے الٰہی کے موافق بنانا اور اپنی خودسری اور نفس پرستی کے بت کو توڑ کر تابع امرِ رب بن جانا۔

۳۔ ان تمام رسومِ جاہلیت سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے خلاف ہوں اور اپنے ظاہر و باطن کو احکامِ شریعت کے مطابق بنانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا۔

۴۔ ان تعصّبات اور دلچسپیوں سے اپنے قلب کو، اور ان مشاغل اور جھگڑوں اور بحثوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جن کی بنا نفسانیت یا دنیا پرستی پر ہو اور جن کی کوئی اور اہمیت دین میں نہ ہو۔

۵۔ فساق و فجار اور خدا سے غافل لوگوں سے موالات اور مودت کے تعلقات منقطع کرنا اور صالحین سے ربط قائم کرنا۔

۶۔ اپنے معاملات کو راستی، عدل، خدا ترسی اور بے لاگ حق پرستی پر قائم کرنا۔

۷۔ اپنی دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کو اقامت دین کے نصب العین پر مرتکز کر دینا اور اپنی

زندگی کی حقیقی ضرورتوں کے سوا ان تمام مصروفیتوں سے دست کش ہو جانا جو اس نصب العین کی طرف نہ لے جاتی ہوں۔

تشریح: ضروری نہیں کہ یہ تغیرات تمام اشخاص میں کمال درجے پر ہوں، مگر ہر شخص کو اس باب میں اپنی تکمیل کی کوشش کرنی ہوگی کیونکہ انہی تغیرات کے اعتبار سے ناقص یا کامل ہونے پر "جماعت اسلامی" میں ہر آدمی کے مرتبے کا تعین ہوگا۔

دفعہ نمبر ۹:

ہر رکنِ جماعت کے لیے لازم ہوگا کہ اپنے حلقۂ تعارف میں اور جہاں تک وہ پہنچ سکے بندگانِ خدا کے سامنے بالعموم جماعت کے عقیدے اور نصب العین (جس کی تشریح دفعہ ۳، ۴ میں کی گئی ہے) کو پیش کرے، جو لوگ اس عقیدے اور نصب العین کو قبول کر لیں انہیں اقامتِ دین کے لیے منظم جدوجہد کرنے پر آمادہ کرے اور جو لوگ جدوجہد کرنے کے لیے تیار ہوں، انہیں جماعت اسلامی کے نظام میں شامل ہونے کی دعوت دے۔

تشریح: اگر کوئی شخص جماعت اسلامی کے نصب العین، طریقِ کار، پروگرام اور نظام جماعت سے اتفاق کا اظہار کرنے کے باوجود کسی وجہ سے رکنیت کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے تیار نہ ہو تو اس کو جماعت کے حلقہ متفقین میں شامل ہونے کی ترغیب دی جائے تا کہ جس حد تک بھی اس کے لیے ممکن ہو وہ اقامتِ دین کی سعی میں جماعت کے ساتھ تعاون کرے۔

نظام شورائی کی وضاحت

اس کے بعد دفعہ نمبر ۱۱ جماعتِ اسلامی پاکستان کے نظام شورائی کی وضاحت اور اس میں ارکان کی رائے کی تشریح یوں کی گئی۔

دفعہ نمبر ۱۱:

جماعت اسلامی پاکستان کا نظام شورائی ہوگا اور تنظیمی لحاظ سے مرکزی اور مختلف علاقائی نظاموں پر مشتمل ہوگا۔

تشریح: نظام کے شورائی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس جماعت میں امیر اور اہلِ شوریٰ کا عزل ونصب ارکانِ جماعت کی رائے سے ہوگا اور جماعت کے سارے کام اسلامی احکام

کے مطابق مشورے سے چلائے جائیں گے۔

فرق مراتب کا معیار اور اختیارات

دفعہ نمبر ۱۲:

اس کا مقصود ارکانِ جماعت کے سامنے وہ اُصولی معیار پیش کرنا ہے جس کے لحاظ سے.... وہ یہ رائے قائم کریں کہ جماعت کے نظم میں کس قسم کے لوگوں کو آگے اور کس قسم کے لوگوں کو پیچھے رہنا چاہیے۔ یہاں صرف یہ بتانا کافی ہوگا کہ دستور کی اس دفعہ کی رُو سے جہاں تک رکنیت کے حقوق کا تعلق ہے اُس میں تمام ارکان جماعت مساوی ہیں۔لیکن جہاں تک ذمہ دارانہ مناصب کے استحقاق کا تعلق ہے تو اُس کے لیے اہلیت اور معیار پر گفتگو ہم آئندہ مناسب مقام پر کریں گے۔

- دستور کی دفعہ ۱۶ کی رُو سے جماعتِ اسلامی پاکستان کے تمام اُمور میں آخری اختیارات اُس کے ارکان کے اجتماعِ عام کو حاصل ہوں گے۔

- دفعہ ۱۷ ذیلی شق نمبر ۳ کے تحت امیر جماعت کا تقرر ارکانِ جماعت بلاواسطہ انتخاب کے ذریعے سے کریں گے اور اس انتخاب میں آرا کی مجرّد اکثریت فیصلہ کن ہوگی۔

- دفعہ ۱۹ کے تحت امیرِ جماعت مجلس شوریٰ اور ارکانِ جماعت کے سامنے جواب دہ ہوگا۔

- دفعہ ۲۱ شق نمبر ا کے تحت مجلس شوریٰ کے منتخب ارکان کا انتخاب ارکانِ جماعت اپنے براہِ راست ووٹوں سے کریں گے اور اسی طرح دفعہ ۷۱ کی رُو سے ضلعی مجلس شوریٰ ارکان ضلع کی براہِ راست منتخب کردہ ہوگی۔

- دفعہ ۲۶ کی رُو سے مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاسوں میں عام ارکانِ جماعت سامع کی حیثیت سے شریک ہوسکیں گے۔

- دفعہ ۴۰ کی رُو سے امیر صوبہ کا عزل ونصب امیر جماعت کے اختیار میں ہوگا اور وہ اس میں جماعتی مصالح کے ساتھ ارکانِ صوبہ کی رائے کو زیادہ سے زیادہ ملحوظ رکھے گا۔

- دفعہ ۴۴ کے تحت صوبے کی مجلس شوریٰ ارکانِ صوبہ کی براہِ راست منتخب کردہ ہوگی۔

- اس طرح دفعہ ۵۸ کی رُو سے ہر حلقے کی مجلس شوریٰ ارکانِ حلقہ کی براہِ راست منتخب

کردہ ہوگی۔

دفعہ ۸۹ شق (د) کی رُو سے مجلس شوریٰ (خواہ مرکزی ہو یا ماتحت) کے کسی رکن کو اُس کے حلقۂ انتخاب کے اجتماعِ ارکان میں کم از کم دوتہائی اکثریت اُس کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کردے، اُسے اُس مجلسِ شوریٰ کی رکنیت سے علیحدہ کردیا جائے گا۔

نظم جماعت کو چلانے والوں کے اوصاف

۔ دستور کی دفعہ ۱۲ کے تحت ذمہ دارانہ مناصب کے استحقاق کا فیصلہ کسی کی خاندانی وجاہت، یا شہرت و ناموری، یا دولت و ثروت، یا علمی اسناد کی بنا پر نہ ہوگا بلکہ اس بنیاد پر ہوگا کہ کون اللہ اور رسول کے احکام کا زیادہ پابند ہے، دین کے فہم اور اس کے مطابق عمل میں زیادہ بڑھا ہوا ہے، تحریکِ اسلامی کے کام کو چلانے کی زیادہ اہلیت رکھتا ہے اور اس جماعت کے نصب العین کی خاطر وقت، محنت، ذہانت اور مال کی بے دریغ قربانی کرنے والا ہے۔

جولوگ دفعہ ٦ کے مطابق رکنیت کی لازمی شرطیں پوری کردیں، مگر نہ تو دفعہ ۸ کے مطابق اپنی تکمیل کی کوئی خاص کوشش کریں، نہ جماعت کے کاموں میں کسی خاص سرگرمی کا اظہار کریں اور نہ اپنی حیثیت کے مطابق مال، وقت اور قوت اس نصب العین کی راہ میں صَرف کریں جس کے لیے یہ جماعت جدوجہد کررہی ہے، وہ رکن جماعت تو رہ سکتے ہیں مگر اس کے اہل نہیں ہوسکتے کہ اس جماعت کے نظام میں ان کو پیش روی کا مقام دیا جائے یا ذمہ داری کے مناصب سونپے جائیں۔ ایسے کسی شخص کو اگر اس کی دوسری حیثیات کا لحاظ کر کے یہ مرتبہ دیا جائے گا تو وہ اس دستور کی خلاف ورزی سمجھا جائے گا۔

امرائے جماعت کے اوصاف:

دفعہ نمبر ۱۳:

امیر (خواہ وہ مرکزی ہو یا ماتحت) کے انتخاب وتقرر میں حسب ذیل اوصاف کو مدنظر رکھا جائے:

۱۔ یہ کہ نہ وہ امارت کا خود امیدوار ہو اور نہ اس سے کوئی ایسی بات ظہور میں آئی ہو جو یہ پتہ دیتی ہو کہ وہ امارت کا خودخواہشمند یا اس کے لیے کوشاں ہے۔

۲۔ یہ کہ ارکانِ جماعت اس کے تقویٰ، علم کتاب وسنت، امانت و دیانت، دینی

بصیرت، تحریکِ اسلامی کے فہم، اصابتِ رائے، تدبر، قوتِ فیصلہ، راہِ خدا میں ثبات و استقامت اور نظمِ جماعت کو چلانے کی اہلیت پر اعتماد رکھتے ہوں۔

۳۔ یہ کہ صوبہ وحلقہ کی امارت کی صورت میں کم از کم دو سال سے اور علاقائی یا ضلعی امارت کی صورت میں کم از کم ایک سال سے جماعت کا رکن ہو، الا یہ کہ امیر جماعت اس کو اس شرط سے مستثنیٰ کرنے کی ضرورت سمجھے۔

مجالسِ شوریٰ کے ارکان کے اوصاف

دفعہ نمبر ۱۴:

مجلس شوریٰ (خواہ وہ مرکزی ہو یا ماتحت) کی رکنیت کے لیے کسی شخص کے انتخاب میں حسب ذیل اوصاف کو مدنظر رکھا جائے گا۔

۱۔ یہ کہ نہ وہ مجلس کی رکنیت کا خود امیدوار ہو اور نہ اس سے کوئی ایسی بات ظہور میں آئی ہو جو یہ پتہ دیتی ہو کہ وہ رکنیت کا خواہش مند یا اس کے لیے کوشاں ہے۔

۲۔ یہ کہ وہ علم وتقویٰ، امانت ودیانت، فہم وبصیرت، خدا کی راہ میں ثبات واستقامت اور دعوت کے سلسلے میں خدمات کے لحاظ سے قابل اعتماد اور عام ارکان سے ممتاز ہو۔

امیر جماعت کے فرائض

دفعہ نمبر ۱۹:

۱۔ نظمِ جماعت اور تحریک کو چلانے کی آخری ذمہ داری امیر جماعت پر ہوگی اور وہ مجلس شوریٰ اور ارکانِ جماعت کے سامنے جواب دہ ہوگا۔

۲۔ جماعت کی پالیسی کی تشکیل اور اہم مسائل کے فیصلے امیر جماعت مرکزی مجلسِ شوریٰ کے مشورے سے کرے گا۔

۳۔ امیر جماعت کا فرض ہوگا کہ:

(الف) خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور وفاداری کو ہر چیز پر مقدم رکھے۔

(ب) جماعت کے مقصد اور نصب العین کی دل وجان سے خدمت کو اپنا اولین فرض سمجھے۔

(ج) اپنی ذات اور ذاتی فائدوں پر جماعت کے مفاد اور اس کے کام کی ذمہ داریوں کو ترجیح دے۔

(د) ارکانِ جماعت کے درمیان ہمیشہ عدل اور دیانت سے حکم کرے۔

(ہ) جو امانتیں جماعت کی طرف سے اس کے سپرد کی جائیں ان کی پوری حفاظت کرے۔

(و) اس دستور کا خود پابند رہے اور اس کے مطابق نظم جماعت کو قائم کرنے کی پوری کوشش کرے۔

۴۔ امیر جماعت کو حسب ذیل اختیارات حاصل ہوں گے:

(الف) مجلس شوریٰ کے ارکان میں سے اپنی مجلسِ عاملہ نامزد کرنا۔

(ب) اہم معاملات میں اگر کوئی فوری قدم اٹھانے کی ضرورت ہو اور مجلسِ عاملہ یا مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد کرنے کا امکان نہ ہو تو مجلس عاملہ یا مجلس شوریٰ کے جن ارکان سے بھی بروقت مشورہ لیا جا سکتا ہو، ان کے مشورے سے قدم اٹھانے کا اختیار۔

(ج) مجلسِ شوریٰ کے ارکان میں سے یا مجلس کے مشورے سے نائب امراء مقرر کرنے کا اختیار۔

(د) جماعت کے جملہ انتظامی معاملات کی انجام دہی، نیز جماعت کے مفاد میں مجلسِ شوریٰ کی عائد کردہ پابندیوں (اگر کوئی ہوں) کے تحت جماعت کی املاک میں تصرف کرنا۔

(ہ) جماعت میں ارکان کا داخلہ (دفعہ ۷) اور اس سے ان کی علیحدگی (دفعہ ۹۰)

(و) کسی ماتحت جماعت کو معطل کرنا یا توڑ دینا۔ (دفعہ ۹۱)

مرکزی مجلس شوریٰ کے فرائض:

دفعہ نمبر ۳۰:

۱۔ مرکزی مجلسِ شوریٰ کا بحیثیت مجموعی اور اس کے ارکان کا فرداً فرداً فرض ہوگا کہ:

(الف) وہ خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت و وفاداری کو ہر چیز پر مقدم رکھیں گے۔

(ب) وہ امیر جماعت اور خود اپنے آپ پر ہمیشہ نگاہ رکھیں گے کہ وہ جماعت کے عقیدہ

پر قائم، اس کے نصب العین سے وابستہ اور صحیح اسلامی طریقِ کار کے پابند ہیں۔

(ج) مجلس کے اجلاسوں میں پابندی کے ساتھ شریک ہوں۔

(د) ہر معاملہ میں اپنے علم اور ایمان وضمیر کے مطابق اپنی حقیقی رائے کا صاف صاف اظہار کریں۔

(ہ) جماعت کے اندر مستقل پارٹیاں اور بلاک بنانے سے محترز رہیں اور اگر مجلسِ شوریٰ یا جماعت میں کوئی شخص اس کی کوشش کرتا نظر آئے تو اس کی ہمت افزائی کرنے یا اس سے تغافل برتنے کی بجائے اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کریں۔

(و) جماعت اور اس کے کام میں جہاں کوئی خرابی محسوس ہو، اسے دور کرنے کی کوشش کریں۔

۔ دستور کی دفعہ ۳۰ (۲) کے تحت مرکزی شوریٰ کے بشمول دیگر یہ خاص اختیارات ہونگے:

(الف) جماعت کی پالیسی کی تشکیل.

(ب) امیر جماعت کی معزولی بشرطیکہ مجلس کے کل منتخب ارکان کی دوتہائی اکثریت سے ان کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد منظور ہو جائے۔

(ج) دستورِ جماعت کی تعبیر وترمیم اور جماعت کے نظام میں ردوبدل کا اختیار.

۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ دستور جماعتِ اسلامی کی رُو سے جماعت کے اندر داخلہ کی شرائط، ارکان کی ذمہ داریاں، فرائض اور اختیارات اور جماعت کے نظم میں مناصب اور اداروں کی تشکیل میں ان کے کردار کی بطور انتخابی ادارہ تفصیلات سامنے لے آئیں۔

دراصل کسی بھی تنظیم میں داخلہ یا شامل ہونے کے وقت یہ انتہائی ضروری ہے کہ آپ کو اُس تنظیم کا مقصد، مشن اور اُس مقصد کے حصول کے طریق کار سے پوری طرح آگاہی ہو۔ تبھی تو آپ پوری تندہی اور لگن سے اس مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں موثر کردار ادا کر سکیں گے۔ اور جب آپ اُس مشن کی بارآوری کے لیے باقاعدہ حلف اُٹھا چکے ہوں تو پھر اس راہ میں کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے کیونکہ وہ اب آپ کی زندگی کا مشن بن چکا ہے۔

اس سلسلے میں جب آپ رکنیت کا حلف اُٹھاتے ہیں۔

میں ـــــــــــــ ابن ــــــــــــــ

جسے جماعت اسلامی ـــــــــــــــ کا امیر مقرر/منتخب کیا گیا ہے۔

اللہ رب العالمین کو گواہ کر کے اقرار کرتا ہوں کہ میں:

۱۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت و وفاداری کو ہر چیز پر مقدم رکھوں گا۔

۲۔ جماعتِ اسلامی کے نصب العین کی دل و جان سے خدمت کو اپنا اولین فرض سمجھوں گا۔

۳۔ اپنی ذات اور ذاتی فائدوں پر جماعت کے مفاد اور اس کے کام کی ذمہ داریوں کو ترجیح دوں گا۔

۴۔ ارکانِ جماعت کے درمیان ہمیشہ عدل اور دیانت سے حکم کروں گا۔

۵۔ جماعت کی جو امانتیں میرے سپرد کی جائیں گی اُن کی اور نظام جماعت کی پوری پوری حفاظت کروں گا اور

۶۔ جماعت کے دستور کا پابند اور وفادار رہوں گا۔

اللہ تعالیٰ مجھے اس عہد کو وفا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

تو آپ منجملہ اور شرائط کے جو دفعہ ۶، ۷، ۸ میں مذکور ہیں، اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ آپ نے جماعت کے دستور میں درج کردہ عقیدہ کی تشریح کو سمجھ لیا ہے جو دستور کی دفعہ ۳ میں درج ہے اور دفعہ ۴ میں درج نصب العین کو بھی سمجھ لیا ہے اور اب پورے شعور اور ذمہ داری سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور فلاحِ اُخروی کو اپنا مقصد سمجھ لیا ہے۔ تو یہ حلف اور اقرار اور یہ کلمہ کی شہادت کوئی معمولی بات نہیں۔ کہ جس کے سلسلے میں پھر غفلت، سستی، کاہلی اور کوتاہی کا مظاہرہ کیا جائے کیونکہ پھر آپ اس کے لیے اللہ کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ یہ ایک بہت بڑی اور بھاری ذمہ داری ہے۔

اب دیکھیے دستور آپ کو۔ جماعت کے تمام اُمور کا ذمہ دار بناتا ہے۔ رکن کی حیثیت سے آپ کی ذمہ داری ہے کہ:

قیادت اور اُمرا کا انتخاب کریں۔ امرا اور قیادت کے اوصاف دستور نے بتا دیے ہیں۔

مجلس شوریٰ کا انتخاب تمام لیولز پر آپ کی براہِ راست ذمہ داری بتائی گئی ہے۔ اور ان قیادتوں اور اداروں کا جماعت اسلامی کو اپنے نصب العین کے مطابق چلانا اور ان کی نگرانی کہیں براہ راست اور کہیں بالواسطہ آپ کی ذمہ داری بنتی ہے۔

لٰہذا جماعت کے نظم میں کسی قسم کا بگاڑ، اس کا اپنے نصب العین سے انحراف یا اس کی طے شدہ پالیسی اور مقصد سے دوری، ان سب باتوں کی ذمہ داری ارکان ہی کو اُٹھانی پڑے گی کیونکہ یہ سب ادارے اُنہی کے منتخب کردہ ہیں۔

جماعتِ اسلامی کا موجودہ بحران اس وجہ سے تو پیدا ہوا کہ کسی بھی لیول اور درجہ پر ان ارکان اور اداروں نے اپنی ذمہ داریوں کو دی گئی شرائط کے مطابق سرانجام نہیں دیا۔ اور اس ضمن میں وہ بوجوہ مختلف مصلحتوں کا شکار ہوئے۔ بلکہ بعض غلطیاں اس بنا پر بھی سرزد ہوئیں کہ قیادت اور اداروں میں اُس صلاحیت، اہلیت، بصیرت اور دور اندیشی کا فقدان پایا گیا جو اس ہنگامی اور مشکل دور کا تقاضا تھا۔

۔ جماعت کے ارکان کی یہ بھی کمزوری رہی کہ وہ حق کی بات کو قواعد کی پیچیدگیوں کی وجہ سے آگے نہ لا سکے۔ اور بعض انتہائی خلوص کے ساتھ یہ سمجھتے رہے کہ کہیں اُن کی وجہ سے جماعت گروہ بندی کا شکار نہ ہو جائے۔ حالانکہ بحیثیت رکن، بحیثیت رکن شوریٰ وغیرہ اُسے بغیر لگی لپٹی اپنی صائب رائے جو کہ اُس کی دینی، دستوری اور اخلاقی ذمہ داری تھی۔ متعلقہ فورم تک پورے دلائل سے پہنچانی چاہیے تھی۔

۔ پھر جماعت کے ارکان میں یہ بھی کمزوری رہی کہ متعلقہ فورم میں خاموش رہنے پر بعد میں جماعتی حلقوں میں اپنی خاموشی کے لیے جوازات تلاش کرتے رہے جو کہ ایک نامناسب حرکت تھی۔

۔ آخر جماعت کے ارکان میں یہ کمزوریاں کیوں در آئیں؟ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ بات ابتدا سے ہی واضح ہو جائے کہ آئیڈیل حالت تو کبھی achieve نہیں کی جا سکتی اور نہ کی جا سکی ہے چاہے وہ جماعت کا ابتدائی دور ہو یا اب کا دور۔ کمزوریاں انسانوں

میں ہی ہوتی ہیں اور انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ ان کا ادراک کرے اور پھر ان کی دوری اور انسداد کا بندوبست کرے۔

- جماعت کے ابتدائی دور میں جماعت کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بھی اس کو observe کیا، ہدایات دیں اور اقدامات کیے اور اس طرح کافی حد تک ان کمزوریوں پر قابو پالیا گیا۔ یہاں جماعت کی رودادوں سے چند اقتباسات نقل کرنا شاید اس کی نشاندہی کے لیے کافی ہوگا:

''جماعت میں جب کوئی نیا شخص داخل ہو تو اُسے پورا احساسِ ذمہ داری دلا کر از سرِ نو کلمہ شہادت ادا کروایا جائے۔ اس تجدید ایمان کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جو شخص آج تجدید ایمان کر رہا ہے وہ اب تک کافر تھا اور اب اسلام لا رہا ہے، بلکہ اُس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جو عہد اُس کے اور خدا کے درمیان پہلے سے موجود تھا آج وہ اُسے تازہ، خالص اور مضبوط کر رہا ہے''۔ (رودادِ جماعتِ اسلامی حصہ اول صفحہ ۴۱)

''جو شخص جماعت میں داخل ہو اُس کو تحریک اسلامی کے لٹریچر کا بیشتر حصہ پڑھوا دیا جائے تاکہ وہ اس تحریک کے تمام پہلوؤں سے واقف ہو جائے اور تحریک کے ارکان میں ذہنی و عملی ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ اس معاملے میں کسی کے متعلق یہ فرض نہ کر لیا جائے کہ وہ پہلے ہی سب کچھ سمجھتا ہوگا۔ اگر اس مفروضے پر ایسے لوگوں کی بڑی تعداد جماعت میں داخل کر لی گئی جو اس تحریک کے لٹریچر پر نظر نہ رکھتے ہوں تو اندیشہ ہے کہ جماعت کے ارکان متضاد باتیں اور متضاد حرکات کریں گے''۔ (ایضاً صفحہ ۴۲)

''جماعت کے ارکان کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ایک بہت بڑا دعویٰ لے کر بہت بڑے کام کے لیے اُٹھ رہے ہیں۔ اگر اُن کی سیرتیں اُن کے دعویٰ کی نسبت سے اس قدر پست ہوں کہ نمایاں طور پر اُن کی پستی محسوس ہو تو وہ اپنے آپ کو اور اپنے دعوے کو مضحکہ بنا کر رکھ دیں گے۔ اس لیے ہر شخص کو جو اس جماعت میں شامل ہو اپنی دُہری ذمہ داری محسوس کرنی چاہیے۔ خدا کے سامنے تو وہ بہرحال ذمہ دار ہے مگر خلق خدا کے سامنے بھی اُس کی ذمہ داری بہت سخت ہے.... آپ کی ایک معمولی لغزش نہ صرف جماعت کے دامن پر بلکہ اسلام کے دامن پر دھبہ

لائے گی اور بہت سے لوگوں کے لیے سببِ گمراہی بن جائے گی۔ (ایضاً صفحہ ۴۴، ۴۵)

محرم ۱۳۶۱ھ بمطابق فروری ۱۹۴۲ مجلس شوریٰ میں کام کی رفتار کا جائزہ لیتے ہوئے جو اُمور بہ اتفاق طے ہوئے اُس میں ارکانِ جماعت کے سلسلے میں من جملہ اور باتوں کے یہ ہدایت بھی دی گئی:

’’جماعت کا جائزہ لینے سے معلوم ہوا ہے کہ نظامِ جماعت میں بعض ایسے اصحاب بھی پائے جاتے ہیں جو ذہنی حیثیت سے ابھی تک یکسو نہیں ہوئے ہیں۔ اور اس جماعت کے مسلک وطریق کار کو پوری طرح سمجھے بغیر جماعت میں داخل ہو گئے ہیں۔ اور اُن سے کچھ زیادہ تعداد ایسے ارکان کی ہے جن کی زندگی میں قابل اطمینان تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ یا جن کے اندر اپنے نصب العین کے لیے کام کرنے کا اندرونی جذبہ ابھی تک مشتعل نہیں ہوا ہے کہ وہ کسی بیرونی تحریک کے بغیر خود اپنے جذبِ دِل کے تقاضے سے سرگرم عمل ہوں‘‘۔ (ایضاً صفحہ ۵۳)

اکتوبر ۱۹۴۲ء کی مجلس شوریٰ نے مندرجہ بالا کمزوریوں کا دوبارہ تذکرہ کر کے ایسے ارکان کی اصلاح کے لیے عملی اقدام کی یہ ہدایت دی:

’’جماعت کے نظام میں احتیاط کی کوششوں کے باوجود ایک معتدبہ تعداد ایسے لوگوں کی داخل ہو گئی ہے جن کی ذہنی، اخلاقی و دینی حالت اس جماعت کی رکنیت کے لیے کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ ایسے ارکان کی اصلاح خیال اور اصلاحِ حال کے لیے ایک مناسب مدت (جس کا تعین ہر شخص کی حالت کے لحاظ سے ہی ہوسکتا ہے) مقرر کی جائے۔ اور اس دوران میں اصلاح کی پوری کوشش کی جائے۔ اور اگر اصلاح نہ ہو سکے تو اُن سے درخواست کی جائے کہ اُس وقت تک نظامِ جماعت سے باہر رہیں جب تک وہ کم از کم اُس معیار پر نہ پہنچ جائیں جو اس جماعت کی رکنیت کے لیے مطلوب ہے۔ نیز آئندہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ کسی شخص کو اُس وقت تک جماعت میں نہ لیا جائے جب تک کہ وہ جماعت کے مسلک سے پوری طرح واقف نہ ہو جائے اور اُس کی زندگی میں عملاً نمایاں تبدیلی نہ ہو‘‘۔ (ایضاً صفحہ ۷۱)

ارکانِ جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے بانیٔ تحریک فرماتے ہیں:

’’جس مقصد کے لیے ہمیں اُٹھ کر کام کرنا ہے اُس کا اولین تقاضا ہے کہ ہم میں صبر ہو،

تدبر اور معاملہ فہمی ہو، اور اتنا مضبوط ارادہ موجود ہو جس سے ہم دور اُس نتائج کے لیے لگا تار اَن تھک سعی کرسکیں۔ بے صبری کے ساتھ جلدی جلدی نتائج برآمد کرنے کے لیے بہت سے ایسے سطحی کام کیے جاسکتے ہیں جن سے ایک وقتی ہلچل برپا ہو جائے، لیکن اس کا کوئی حاصل اس کے سوا نہیں ہے کہ کچھ دنوں تک فضا میں شور رہے اور پھر ایک صدمہ کے ساتھ سارا کام اس طرح برباد ہو کہ مدت ہائے دراز تک دوبارہ اس کا نام لینے کی بھی کوئی ہمت نہ کر سکے۔ (ایضاً صفحہ ۸۳)

انتخاب کے بارے میں فرمایا

''جماعت بننے کے ساتھ ہی آپ اپنے لیے ایک امیر منتخب کرلیں۔ امیر کے انتخاب میں آپ کو جو امور ملحوظ رکھنے چاہئیں وہ یہ ہیں کہ کوئی شخص جو امارت کا امیدوار ہو، اُسے ہرگز منتخب نہ کیا جائے۔ کیونکہ جس شخص میں اس کارِعظیم کی ذمہ داری کا احساس ہوگا وہ کبھی اس بار کو اٹھانے کی خود خواہش نہ کرے گا۔ اور جو اس کی خواہش کرے گا وہ دراصل نفوذ و اقتدار کا خواہشمند ہوگا نہ کہ ذمہ داری سنبھالنے کا۔ اس لیے اللہ کی طرف سے اس کی نصرت و تائید کبھی نہ ہوگی۔ انتخاب کے سلسلہ میں لوگ ایک دوسرے سے نیک نیتی کے ساتھ تبادلہ خیالات کر سکتے ہیں، مگر کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف نجویٰ اور سعی نہ ہونی چاہیے۔ شخصی حمایت و موافقت کے جذبات کو دل سے نکال کر بے لاگ طریقہ سے دیکھیے کہ آپ کی جماعت میں کون ایسا شخص ہے جس کے تقویٰ، علم کتاب وسنت، دینی بصیرت تدبر، معاملہ فہمی اور راہ خدا میں ثبات و استقامت پر آپ سب سے زیادہ اعتماد کر سکتے ہیں''۔ (ایضاً صفحہ ۲۲، ۲۳)

ارکان کی چھان بین:

''شعبۂ تنظیم کے قائم ہونے پر مقامی جماعتوں اور ارکان کی جانچ پڑتال شروع ہوئی۔ چنانچہ ایک سال کی مسلسل کانٹ چھانٹ کے بعد اب ارکان کی مجموعی تعداد ساڑھے چار سو (۴۵۰) (جو کہ پہلے اندازاً سات سو پچاس (۷۵۰) تھی) سے بھی کم رہ گئی ہے۔ اور ابھی اس چھانٹ کا سلسلہ جاری ہے۔ بعض جماعتوں کو بھی اُن کی سرد مہری اور کم سے کم جماعتی اوصاف اور معیار کارکردگی سے نیچے گر جانے کی وجہ سے توڑ دینا پڑا''۔ (روداد جماعت اسلامی حصہ سوم صفحہ ۲۴)

قیم جماعت میاں طفیل محمد مرحوم نے کل ہند جماعت کے اجتماع منعقدہ الہ آباد ۵ تا ۷ اپریل ۱۹۴۶ میں رپورٹ پیش کرتے ہوئے جماعتِ اسلامی میں داخلے کے لیے رکنیت کے اونچے معیار کے بارے میں فرمایا:

جماعت اسلامی میں داخلہ اور اس کا طریق:

ملک کے مذکورہ ماحول اور مشکلات میں رہتے ہوئے جن بندگان خدا نے متذکرہ صدر شرائط کو سامنے رکھتے ہوئے گذشتہ سال جماعت میں شریک ہونے کی درخواستیں کی ہیں ان کی تعداد ۲۲۴ ہے۔ ان میں سے بیشتر احباب ایسے تھے جنہوں نے تقریباً ہمارا پورا لٹریچر پڑھ لیا تھا اور ان کی زندگیوں میں بھی اس کا خاصہ اثر موجود تھا اور وہ جماعت کے کام اور طریق کو خاصی حد تک سمجھ چکے تھے، لیکن اب ہم نے چونکہ جماعت میں داخلے کے معیار کو زیادہ اونچا کردیا ہے اس لیے ان میں سے بہت تھوڑے حضرات کو جماعت میں لیا گیا۔ اب نئے داخلے کے لیے ہمارا طریق یہ ہے کہ درخواست آنے پر پہلے بذریعہ مراسلت عرصہ تک اس امر کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا امیدوار صاحب ہماری بات کو ٹھیک ٹھیک سمجھ گئے ہیں اور اس کے سارے مقتضیات تک اس کی نظر پہنچ گئی ہے یا نہیں اور اس کی زندگی میں مجملا وہ اخلاقی تغیر واقع ہوا ہے یا نہیں جو اس کام کے لیے مطلوب ہے۔ اس کے بعد پھر گیارہ معین سوالات و جواب چھپ کر تیار ہو گئے ہیں اور ہر رکن جماعت کے پاس اطلاعاً بھیج دیے گئے ہیں، تفصیلی اور نمبروار جوابات کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ اگر اس کے جوابات ٹھیک آجائیں تو یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ تاثر وقتی اور ہنگامی تو نہیں تھا انہیں ایک مدت تک امیدواری کی حالت میں جماعت کا کام کرنے کی ہدات کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جماعت کا باقاعدہ رکن بننے سے پہلے وہ ارکان کی طرح دستور جماعت اپنے اوپر خود نافذ کریں اور اس کے مطابق کام کر کے دکھائیں۔ اگر قریب میں کوئی مقامی جماعت یا منفرد رکن ہوتا ہے تو ان سے امیدوار رکنیت کو وابستہ کردیا جاتا ہے۔ اس طرح دو تین مہینے اس کا رویہ دیکھ کر پھر جماعت میں بطور رکن لے لیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ ہم نے اس لیے اختیار کیا ہے کہ ہمیں ارکان کی اکثریت وقلت سے زیادہ بحث نہیں بلکہ اس کے سیرت و کردار اور اخلاق و اخلاص سے ہے۔ اس وقت ہماری نظر اس چیز پر ہے کہ ہر مقام پر ہمیں ایسے پختہ آدمی مل جائیں جو اس

دعوت کے کام کو ذمہ دارانہ اور قابل اعتماد طریقے سے چلانے کے اہل ہوں اور لوگوں کی رہنمائی وقیادت اسلامی اصولوں پر کر سکتے ہوں۔

ہماری اسی پالسی کا نتیجہ ہے کہ مذکورہ ۲۲۴ درخواست کنندگان میں سے صرف ۴۷ حضرات کو جماعت میں لیا گیا اور نہ لیے جانے والے حضرات میں ایسے احباب بھی شامل تھے جنھوں نے عمر بھر کی پیدا کردہ ہزاروں روپیوں کی جائداد ہمارے علم واطلاع یا کسی دوسرے کے دباؤ یا اشارہ کے بغیر محض اپنے ایمان سے مجبور ہو کر اس کے اصل حقداروں کے حوالہ کر دی تھی اور یہ اس حال میں کہ اس کے بعد ان کے پاس ایک پائی بھی نہ بچی تھی۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ان صاحب نے یہ جائیداد ایک اور مذہبی تحریک کی لیڈری کے زمانے میں پیدا کی تھی لیکن جماعتِ اسلامی کے نظریے سے متاثر ہونے سے پہلے نہ کبھی یہ انہیں ایمان کے منافی معلوم ہوئی اور نہ ان کی لیڈری وقیادت پر اس سے کبھی کوئی حرف آیا۔

جماعت اسلامی سے علیحدگی

داخلے کے معیار کو بلند کرنے کے ساتھ ہم نے ان ارکان کا بھی احتساب کرنا شروع کر دیا ہے جو ان پابندیوں کو عائد کرنے سے پہلے جماعت میں آ چکے تھے۔ چانچہ اس سال ۲۴ حضرات سے درخواست کی گئی کہ وہ جماعت سے الگ ہو کر اپنی مزید اصلاح کریں۔ اس میں سے بیشتر کے سلسے میں تو جماعتی کاموں میں پوری دلچسپی نہ لینے کی شکایت تھی۔ ایک صاحب نے اپنی اہلیہ کو معلق کر رکھا تھا اور اس سے جب یہ کہا گیا کہ اسے آباد کریں یا چھوڑ دیں تو وہ نہ جاہلی رسم ورواج کی وجہ سے اسے چھوڑنے پر آمادہ ہوئے اور نہ ان کی طبعیت اور گھریلو حالات نے اسے آباد کرنے پر آمادہ ہونے دیا۔ دوتین حضرات اپنے سابقہ گروہی تعصّبات پر قابو نہ پا سکے۔ دوتین حضرات کو الیکشن کے زمانہ میں قومی درد نے جماعت سے علیحدگی پر مجبور کر دیا اور ان چوبیس کے علاوہ ایک صاحب جنھوں نے ازخود جماعت سے علیحدگی اختیار کی جنھوں نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ ان کے استاد محترم پر کچھ لوگ سیاسی اختلافات کی وجہ سے حملے پر حملے کر رہے تھے۔ اور جماعت میں رہتے ہوئے وہ ان کی حمایت میں لڑائی نہ لڑ سکتے تھے۔ لیکن ان پچیس (۲۵) میں سے کوئی ایک بھی ایسا ہمیں معلوم نہیں ہے جسے جماعت کے نصب العین یا طریق کار سے کوئی اختلاف ہو بلکہ چند ایک کے سوا ہر ایک کو علٰیحدگی کا رنج ہے،

وہ ہمارے قریبی ہمدردوں میں شامل ہیں اور اپنی اصل کے لیے کوشاں ہیں''۔(روداد جماعت اسلامی حصہ چہارم صفحہ نمبر ۳۷ تا ۴۰)

ان تادیبی اقدامات کے علاوہ اصلاح کے لیے قرآن وسنت سے خاص شغف اور تعلق باللہ پر بہت زور دیا گیا۔مولانا مودودیؒ نے فرمایا:

''جماعت کے ارکان کو قرآن اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سیرۃ صحابہ سے خاص شغف ہونا چاہیے۔ان چیزوں کو بار بار زیادہ گہری نظر سے پڑھا جائے اور محض عقیدت کی پیاس بجھانے کے لیے نہیں بلکہ ہدایت ورہنمائی حاصل کرنے کے لیے پڑھا جائے، جہاں ایسا کوئی آدمی موجود ہو جو قرآن کا درس دینے کی اہلیت رکھتا ہو وہاں درس قرآن شروع کر دیا جائے۔

اس تحریک کی جان دراصل تعلق باللہ ہے۔اگر اللہ سے آپ کا تعلق کمزور ہو تو آپ حکومت الہیہ قائم کرنے اور کامیابی کے ساتھ چلانے کے اہل نہیں ہو سکتے۔لہٰذا فرض عبادات کے ماسوا نفل عبادات کا بھی التزام کیجیے۔نفل نماز،نفل روزے اور صدقات وہ چیزیں ہیں، جو انسان میں خلوص پیدا کرتی ہیں، اور ان چیزوں کو زیادہ سے زیادہ اخفا کے ساتھ کرنا چاہیے تاکہ ریا پیدا نہ ہو۔نماز سمجھ کر پڑھیے، اس طرح نہیں کہ ایک یاد کی ہوئی چیز کو آپ زبان سے دہرا رہے ہیں، بلکہ اس طرح کہ آپ خود اللہ سے کچھ عرض کر رہے ہیں۔نماز پڑھتے وقت اپنے نفس کا جائزہ لیجیے کہ جن باتوں کا اقرار آپ عالم الغیب کے سامنے کر رہے ہیں کہیں آپ کا عمل ان کے خلاف تو نہیں ہے اور آپ کا اقرار جھوٹا تو نہیں ہے۔اس محاسبۂ نفس میں جو کوتاہیاں آپ کو محسوس ہوں ان پر استغفار کیجیے، اور آئندہ ان خامیوں کو رفع کرنے کی کوشش کیجیے۔ عبادات میں اس امر کا خیال رکھیے جس قدر عمل آپ دائماً پابندی سے کر سکتے ہوں بس اسی کا التزام کیا جائے۔ نیز یہ کہ ان تمام مجاہدوں اور ریاضتوں اور مشاغل و اوراد سے پرہیز کیا جائے، جو احادیث صحیحہ سے ثابت نہ ہوں اور احادیث کی صحت کے باب میں محدثین ہی سند ہو سکتے ہیں نہ کہ غیر محدثین، خواہ وہ بجائے خود کتنی ہی بڑی شخصیت کے بزرگ ہوں، زیادہ خطرناک بدعات وہ بری چیزیں نہیں جن کی برائی کو سب جانتے ہیں بلکہ وہ بظاہر اچھی چیزیں ہیں جن کو اچھا سمجھ کر شریعت میں اضافہ کر لیا جاتا ہے''۔(روداد جماعتِ اسلامی حصہ اول صفحہ، ۴۳، ۴۴)

اتنے طویل اقتباسات درج کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی تا کہ واضح ہو کہ جماعت کی قیادت اور ادارے ارکان کی ذمہ داریوں، اُن کی سیرت و کردار اور مروجہ معیار پر نہ اُترنے پر تادیبی اور اصلاحی اقدامات کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ جماعت جس مشن اور مقصد کو لے کر اُٹھی ہے اُس مقصد اور مشن سے کس طرح انحراف کی گنجائش پیدا نہ ہو۔

گزشتہ مضمون'' جماعت اسلامی۔ انحطاط اور احیاء'' میں منجملہ اور تجاویز کے ایک تجویز ہم نے یہ بھی دی تھی کہ ارکان سے باقاعدہ تجدید رکنیت کا عہد لیا جائے۔ اور یہ کوئی انوکھی اور نرالی بات نہیں تھی۔

مندرجہ بالا اقتباسات کے مطالعہ سے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ماضی میں بھی جب ان کمزوریوں اور غلطیوں کو محسوس کیا گیا یا اُن کی نشاندہی کی گئی۔ تو ہر ہر مرحلہ پر ارکان کی جانچ پڑتال اور چھان بین کا عمل دُہرایا گیا۔ ہاں البتہ فرق یہ تھا کہ قیادت نے ارکان کی کمزوریوں پر اُن کا محاسبہ کیا اور ارکان کو اپنی قیادت پر اعتماد تھا اور وہ اُن کے اس عمل کو ڈاکٹر کے جراحی عمل کی طرح مفید سمجھتے تھے۔ لیکن اس بار بحران کی کیفیت بدلی ہوئی ہے ارکان کو پارٹی قیادت پر اعتماد نہیں رہا۔ اور اُس سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے لہٰذا جہاں ارکان اس بات کے لیے تیار ہیں کہ مکمل جانچ پڑتال کی جائے اور ہنگامی طور پر چند مقاصد کی خاطر بھرتی شدہ ارکان کی چھانٹی کی جائے۔ وہاں وہ اس بات کے لیے تیار نہیں ہیں کہ یہ کام اور محاسبہ موجودہ قیادت کے ہاتھوں ہو کیونکہ وہ اس قیادت کو بھی اس کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔

ان حالات میں ہم نے یہ تجویز دی تھی کہ غیر متنازعہ، متقی اور پرہیزگار چند ارکان کی کمیٹی کو یہ اختیار سونپ دیا جائے۔ اور وہ ایک وقتِ مقررہ تک باقاعدہ شرائط رکنیت کی روشنی میں یہ کام انجام دیں۔ اور پھر یہی تجدیدِ عہد کرنے والے ارکان قیادت اور مجالس شوریٰ کا انتخاب کریں۔ اس پر سب کو اعتماد ہو گا۔

اگر مقامی اور مرکزی قیادت اور مجالسِ شوریٰ جیسے اداروں کا انتخاب موجودہ ارکان سے کرایا گیا اور جس کے لیے ہماری معلومات کے مطابق انتخابی عمل شروع ہو چکا ہے۔ تو پھر یہ

جان لیجیے کہ اس انتخاب کا نتیجہ بھی اللہ نہ کرے وہی ہوگا جو آج ہم بھگت رہے ہیں۔ ہماری قیادت سے اپیل ہے کہ وہ خدارا جماعت کے مفاد کے پیش نظر موجودہ انتخابی عمل کو روک دے۔

اب یہاں ہم جماعت کے دوستوں اور بہی خواہوں کی تجاویز کی روشنی میں اس مجوزہ کمیٹی کے ممبران اور طریق کار کے بارے میں چند گزارشات آپ کے سامنے رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

کمیٹی کی تشکیل اور ممبران کی تعداد

ہر صوبے سے دو ممبران اور اسلام آباد اور گلگت بلتستان بشمول آزاد کشمیر سے ایک ایک ممبر اس کمیٹی میں لیا جائے۔ اس طرح ان کی تعداد دس ہوگی۔

کمیٹی ممبران کے انتخاب کی بنیاد:

- تقویٰ، تدبر اور معاملہ فہمی
- جماعت کے قیام ومقاصد اور طریقۂ کار کا پورا شعور
- قرآن پاک وحدیث کا گہرا علم، دینی بصیرت اور اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی۔
- تحریکی اور دوسرے اسلامی لٹریچر کا نہ صرف مطالعہ ہونا بلکہ شعوری طور پر اس کی اہمیت کا ادراک ہونا۔ اس کے مطابق اپنے اور جماعت کے معاملات سے عہدہ برآ ہونا۔
- پاکیزہ کردار کا عملی نمونہ ہونا اور صاحب الرائے ہونا۔
- مکمل طور پر غیر جانبدار ہونا اور ہر حالت میں جماعت کے مفاد کو پیش نظر رکھنا۔

ایسے لوگوں کی تلاش کوئی مشکل کام نہیں کیونکہ بفضلِ الٰہی جماعت میں ان صفات کے حامل بااعتماد لوگ کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ہم قصداً نام لینے سے گریز کر رہے ہیں۔

چونکہ پورے ملک میں ارکان کی تعداد ہزاروں میں ہے اس لیے کمیٹی کو ایسا طریق کار اپنانا ہوگا کہ کم سے کم وقت میں اپنا کام انجام دے سکے۔ اس مقصد کے لیے کمیٹی بشمول تمام ارکان کے لیے ممکن نہ ہوگا کہ وہ فرداً فرداً ہر رکنِ جماعت کا انٹرویو کرے۔ بلکہ کمیٹی دو یا تین

ممبران کے وفود کی شکل میں مختلف مرکزی مقامات پر بیک وقت انٹرویو کرسکتی ہے۔ یہ سارا کام زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ مہینے میں مکمل ہونا چاہیے۔

مرکزی شہروں میں متعلقہ علاقوں کے ارکان کو پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت انٹرویو کیا جائے۔ وقت کے بہتر طور پر استعمال کی خاطر ارکان سے سوالات کا پروفارما بھی develop کیا جاسکتا ہے۔ جو ہر رکن پہلے سے پُر کر کے کمیٹی کے حوالے کرے۔

انٹرویو کے دوران کمیٹی یہ یقینی بنائے کہ:

۱۔ آیا جماعتِ اسلامی میں داخلہ کے وقت یا اُس کے بعد انہوں نے جماعتِ اسلامی کے دستور کا مطالعہ کیا ہے اور کیا وہ جماعت کے عقیدے، اُس کی تشریح سے متفق اور ارکان کے ذمہ داریوں اور اختیارات سے آگاہ ہیں؟

۲۔ کیا ہر رکن کو جماعت کے مقرر کردہ تقویٰ، دینی، علمی اور کردار کی پاکیزگی کے معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے جماعت کا رکن بنایا گیا تھا؟

۳۔ یہ کہ انہوں نے رکن بننے کے لیے قرآن پاک، حدیث اور لٹریچر کا مقرر کردہ نصاب نہ صرف مکمل کیا تھا بلکہ شعوری طور پر سمجھ کر اس کے تحت اللہ کی رضا کے حصول کے لیے جماعت کے مشن کی تکمیل کے لیے اپنے آپ کو وقف کیا تھا۔

۴۔ دوران انٹرویو اُن سے جماعت کے قیام کے مقاصد اور ان کے حصول کے لیے ایک رکن کی حیثیت سے ذمہ داریوں کے احساس کا اندازہ لگانا اور یہ تعین کرنا کہ ان کی سوچوں کا مرکز ومحور جماعت کے ساتھ وابستگی کے ذریعے اللہ پاک کی خوشنودی اور رضا ہے نہ کہ کوئی دوسری چیز۔

۵۔ اُن کی شخصی پختگی اور سوچوں کا محور جانچنے کے لیے۔ اُن سے جماعت کی موجودہ دِگرگوں حالت اور سیاست میں deep involvement کے بارے میں پوچھنا اور اس ناگفتہ بہ حالت سے نکلنے کے لیے ان کے خیالات جاننا۔ تاکہ یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ اُن کی سوچوں میں کتنی پختگی ہے۔ جو کہ جماعت کے ہر رکن کے خیالات میں ہونی چاہیے۔

۶۔اُن سے یہ بھی پوچھا جائے کہ ایک رکن کی حیثیت سے وہ کتنا اپنے آپ کو موجودہ حالات کا ذمہ دار سمجھتے ہیں تا کہ اندازہ لگایا جاسکے کہ اُن میں جماعت کے ارکان ہونے کے ناطے احساس زیاں ہے بھی یا نہیں۔

۷۔انٹرویو کی بنیاد پر ایسے ارکان جو جماعت کے مقرر کردہ پیمانے اور معیار پر پورا نہ اترتے ہوں۔ انہیں حکمت کے ساتھ جماعت کی رکنیت سے فارغ کر دینا چاہیے۔اس کے لیے طریقہ کار ایسا اپنایا جائے کہ اُنکی کسی طور پر بھی دل آزاری نہ ہو اور اس بات کا اندیشہ نہ ہو کہ وہ جماعت سے دور چلے جائیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ ایسے تمام ارکان کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔اور بتایا جائے کہ وہ جماعت کے لیے کس قدر اہم ہیں۔اور جماعت چاہے گی کہ وہ اپنی توانائیاں اللہ کی رضا کے حصول کی خاطر جماعت کے لیے وقف رکھیں۔ اس بات کا احساس دلایا جائے کہ بہتر کارکردگی کے لیے اور اس طرح اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو Improve کریں۔اور بہتر کرنے کی کوشش کریں۔اور انہیں یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی جانی چاہیے کہ اُن کی رکنیت کے بارے میں فیصلہ خود ان کے اور جماعت کے عظیم تر مفاد میں کیا گیا ہے۔

۸۔ایسے ارکان جو جماعت کی رکنیت کے تقاضوں کو کسی حد تک پورا کرتے ہوں اُن کی رکنیت کو معطل کر دیا جائے اور ان کی کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے۔انہیں دور کرنے کا موقع دیا جائے۔اور جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں اس مدت کا تعین ہر رکن کی موجودہ حالت کی بنا پر کیا جائے گا۔

۹۔البتہ ایسے ارکان جو کافی حد تک رکنیت کے معیار پر پورا اترتے ہوں مگر کچھ معمولی کمزوریوں کی نشاندہی ہوئی ہو تو ایسے ارکان کو کمزوریوں کے متعلق آگاہ کر کے انہیں دور کرنے کی نصیحت اور تلقین کی جائے۔

۱۰۔ یہ کمیٹی اگر مناسب سمجھے تو امیدواران رکنیت اور ارکان کے ضروری مطالعہ کے لیے ایک نصاب بھی تجویز کرے جس میں قرآن وحدیث کے منتخب حصوں کے علاوہ دستور

جماعتِ اسلامی اور تحریکِ اسلامی کا وہ لٹریچر بھی ہو جو تطہیر افکار، عقائد و عبادات، تنظیمی معاملات، جماعتی و شخصی اوصاف اور فریضۂ اقامت دین کی اہمیت پر مشتمل ہو۔

حرفِ آخر:

ان اقدامات کو عملی شکل دینے سے پہلے بہتر ہوگا کہ تمام ارکان کو ایک مرکزی مقام پر اکٹھا کیا جائے۔ اور انہی متقی اور غیر متنازع شخصیات سے ایک بار پھر اُن تمام اسباق کا تذکرہ سنا جائے کہ جماعت کے قیام کا مقصد کیا تھا؟ مقصد کے حصول کے لیے جماعت کو کن بنیادوں پر استوار کیا گیا؟ یہ جدو جہد کیسے کردار اور قربانیوں کا تقاضا کرتی ہے؟ آج ہم کہاں کھڑے ہیں؟ آج کے اور مستقبل کے چیلنجز کیا ہیں؟ اُن کا مقابلہ کرنے کے تقاضے کیا ہیں؟ وغیرہ۔ تا کہ دوبارہ اس سبق کو یاد کرنے کی کوشش کی جائے جو ہم بھول چکے ہیں۔ اپنے زیاں کا احساس ہو اور ساتھ ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوئے حالات کے تناظر میں جماعتی مقاصد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مناسب لائحہ عمل اختیار کر سکیں۔

یہ انتہائی صبر آزما اور مشکل کام ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کی توفیق اور تائید حاصل ہو تو سب کام آسان ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ ہماری مساعی میں برکت عطا فرمائے اور ہمیں صحیح فیصلوں کی توفیق سے نوازے، آمین۔

بقیہ: 'قومی ریاست' اور 'قوم پرستی' کے مغربی تصورات

ان حالات میں اسلامی جماعتیں اگر اقتدار میں آ جائیں تو کیا کر لیں گی؟ ترکی نے کیا کر لیا؟ روس سے تعلقات کشیدہ ہوئے ۲۰ لاکھ روسی سیاح نہیں آئے، ترکی کی معیشت خطرے میں پڑی لہٰذا روس سے دوستی ہو گئی۔ جب دوستی کی بنیاد اسلام، شریعت اور مسلمانوں کا مفاد نہیں قومی ریاست کا مفاد ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ امت کو قوم پرستی کے عقیدے سے برأت کا اعلان کرنا ہوگا ورنہ امت لہولہو رہے گی۔